ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

انسانیت کا امتیاز

انسانیت کا امتیاز صرف ربانی علوم ہیں!
ایک عقلی دعوے حکمت شرعیہ کی روشنی میں

از

حضرت مولانا قاری محمد طیب مدظلہ مہتمم دار العلوم دیوبند

ناشر
ادارہ اسلامیات
۱۹۰- انارکلی - لاہور

پہلی بار عکسی طباعت .... دسمبر ۱۹۷۶ء

باہتمام .... اشرف برادرز

ناشر .... ادارہ اسلامیات ۔ لاہور

طباعت .... شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت ....

ملنے کے پتے
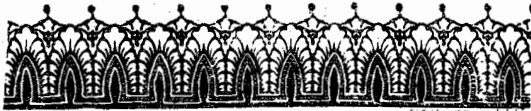
ادارہ اسلامیات، ۱۹۰ ۔ انارکلی لاہور

دارالاشاعت، مولوی مسافرخانہ ۔ کراچی ۱

مکتبہ دارالعلوم ۔ دارالعلوم کراچی ۱۴

ادارۃ المعارف ۔ دارالعلوم کراچی ۱۴

فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنسانیّت کا اِمتیاز

وعلّم اٰدم الاسماء کلّھا ثم عرضھم علی الملٰئکۃ فقال انبئونی باسماء ھٰؤلاء ان کنتم صٰدقین۔ قالوا سبحانک لاعلم لنا الا ما علّمتنا انک انت العلیم الحکیم۔ قال یاٰدم انبئھم باسمائھم فلما انبأھم باسمائھم قال الم اقل لکم انّی اعلم غیب السمٰوات والارض واعلم ما تبدون و ما کنتم تکتمون۔ واذ قلنا للملٰئکۃ اسجدوا لاٰدم فسجدوا الّا ابلیس ابٰی واستکبر وکان من الکافرین۔ صدق اللہ مولانا العظیم۔

مُقدّمہ وتمہید قبل اس کے کہ میں اس آیت کی تفسیر کے متعلق کچھ عرض کروں، ایک مختصر بات جو بطور مقدمہ وتمہید ہو گی بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جس سے آیت کے مقصد کو سمجھنے میں آسانی ہو گی اور وہ یہ ہے کہ اس کائنات کے مالک نے یہ کائنات بنائی تو اسے پورح طرح سجایا اور آراستہ بھی کیا اور اس میں طرح طرح کی ضرورتیں بھی

مہیا فرمائیں زمین کا فرش بچھایا اور اطلاع فرمائی کہ :

وَالْاَرْضَ فِرَاشًا "اور زمین کو فرش بنایا ۔"

اور فرش پر آسمان کا خیمہ تانا اور اُسے ایک محفوظ چھت بنا دیا ۔
چنانچہ بتلایا کہ :۔

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا "اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا۔"

اس چھت میں روشنی کے قندیل لٹکائے تاکہ اس مکان کی فضائیں روشن رہیں اور فرمایا :۔

تَبَارَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ "برکت والی ہے وہ ذات جس نے آسمان
بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرَاجًا میں برج رکھے اور ان میں روشن چراغ
وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا (سورج) اور روشنی بخش چاند رکھا ۔"

پھر ان ستاروں کو چھت کے لیے سامانِ زینت بھی کر دکھایا اور اطلاع دی کہ :۔

اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا "ہم نے آراستہ کیا آسمانِ دُنیا کو زینت
بِزِیْنَةِ الْكَوَاكِبِ ۵ سے جو ستارے ہیں ۔"

پھر اس فرشِ خاک کو بستر بنا کر ایک وسیع ترین دستر خوان بھی بنایا۔ جس سے ہر قسم کے غلّے، ترکاریاں، پھل، غذائیں اور دوائیں اگائیں جس سے ہر قسم کے میٹھے، کھٹے، نمکین اور دُوسرے ذائقوں کے پھل اور دانے نکلتے چلے آتے ہیں۔ اور مطلع فرمایا کہ :۔

وَهُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ "اور وہ ایسا ہے جس نے آسمان کیطرف سے پانی

مَاءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۔

برسایا پھر ہم نے اسکے ذریعہ سے ہر قسم کے نباتات کو نکالا پھر ہم نے اس سے سبز شاخ نکالی کہ اس سے ہم اوپر تلے دانے چڑھے ہوئے نکالتے ہیں اور کھجور کے درختوں سے یعنی ان کے گچھے میں سے خوشے ہیں جو (مارے بوجھ کے) نیچے کو لٹکے جاتے ہیں اور (اسی پانی سے ہم نے) انگوروں کے باغ اور زیتون اور انار کے درخت پیدا کئے جو کہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوتے ہیں"۔

ان سبزیوں کو نمایاں کرنے اور حیات بخشنے کے لیے پانی سے بھری ہوئی ہوائیں رکھیں اور فرمایا کہ :۔

وَاَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ "اور ہم ہی ہواؤں کو بھیجتے رہتے ہیں۔

پھر زمین کو فرش اور خوانِ نعمت بنانے کے ساتھ راہ دار بھی بنایا۔ جس میں جگہ جگہ چلنے پھرنے کے راستے رکھے اور فرمایا :۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۔ "اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے زمین کو مثل فرش کے بنایا تاکہ تم اسکے کھلے رستوں میں چلو"۔

کائنات کا مقصدِ تخلیق

غرض یہ کائنات ایک عظیم تر بلڈنگ اور رفیع الشان قصر کی حیثیت سے تیار فرمائی، جس میں کھانے پینے، چلنے پھرنے، رہنے سہنے، سونے جاگنے اور کام کاج کرنے کے سارے سامان فراہم فرمائے۔ اس کائنات کی یہ ساخت اور بناوٹ کا یہ خاص انداز پکار پکار کر زبانِ حال سے بتلا رہا ہے کہ

ضروریاتِ زندگی سے یہ لبریز مکان کس ضرورت مند مکین کے لیے بنایا گیا ہے۔ خود مقصود نہیں ہے۔ یعنی اس میں کسی کو بسانا مقصود ہے، محض مکان بنانا مقصود نہیں اور بلا شبہ کسی ایسے مکین کو آباد کرنا مقصود ہے جو ان سامانوں کا حاجت مند بھی ہو، اور اس میں ان سامانوں کے استعمال کرنے کی صلاحیت بھی ہو تاکہ یہ سارے سامان ٹھکانے لگیں اور اس مکین سے اس مکان کی آبادی اور زینت ہو۔ کیونکہ مکان مکین کے بغیر ویرانہ، وحشت کدہ اور بے رونق ہوتا ہے۔ سو اس عالم میں ارادی کاروبار اور اختیاری تصرّفات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بلڈنگ میں بسنے والی ذی شعور اور حسّاس مخلوق جو اس کائنات کو استعمال کر سکتی ہیں چار ہی قسم کی ہیں۔

ذی شعور مخلوقات

ایک حیوانات ہیں جن میں سینکڑوں انواع گھوڑا، گدھا، بیل، بکری، طوطا، مینا، شیر، بھیڑیا، سانپ بچھو، چرند، پرند اور درندوغیرہ ہیں۔ دوسرے جنّات ہیں جو آنکھوں سے نظر نہیں آتے مگر آثار سے سمجھ میں آتے ہیں، اور بلحاظ نسل مختلف قبائل اور خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ تیسرے ملائکہ ہیں جو نوری ہونے کے سبب لطیف اور نادیدہ ہیں۔ مگر اپنے آثار کے لحاظ سے مثل دیدہ ہیں۔ اور نہ مادہ ہونے اور نسل کشی سے بری ہیں۔ اور چوتھے بنی نوع انسان ہیں جو زمین کے ہر خطہ میں بسے ہوئے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں، یہی چار مخلوقات ہیں جو اپنی صلاحیت کے مطابق اپنے اندر احساس و شعور رکھتی ہیں اور اس کائناتی بلڈنگ کے باشندے اور جائز وارث ہونے کے مستحق ہیں۔ اس زمین و

آسمان میں اُن کے حقوق ہیں اور وہ مالک کائنات کی طرف سے اُن کے حقدار بنائے گئے ہیں۔ کسی کو حق نہیں کہ اُن کے حقوق کو پامال کرے یا انہیں منافع دینے سے بے حق کر دے۔ غذا، مکان، تن پوشی اور رہن سہن وغیرہ میں ان سب کے حقدار بنائے گئے ہیں۔ کسی کو حق ہے کہ رہنے کے لیے مکان تلاش کریں۔ غذا کے لیے مناسب حال کھانا مہیا کریں اور تن ڈھانکنے کے لیے مناسب بدن پوشش مہیا کریں۔ اندریں صورت جو بھی ان میں سے کسی کے جائز حق میں رخنہ انداز ہوگا وہ بلاشبہ مجرم اور مستحق سزا ہوگا۔

اسلام میں حیوانات کے حقوق کی حفاظت

چنانچہ شریعتِ اسلام نے جس طرح انسانوں کے حقوق کی حفاظت کی ہے اسی طرح حیوانات کے حقوق کی بھی پوری پوری حفاظت و رعایت فرمائی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک اُونٹ آنحضرت صلعم کی خدمت میں بلبلاتا ہُوا حاضر ہُوا۔ اسکی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ اُس نے آتے ہی حضورؐ کے قدموں پر سر رکھ دیا اور بلبلاتا رہا۔ آپؐ نے فرمایا بلاؤ اس کے مالک کو۔ مالک حاضر کیا گیا۔ فرمایا یہ اونٹ تیری شکایت کر رہا ہے کہ تو اسکی طاقت سے زیادہ بوجھ اس پر لادتا ہے۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! شکایت بجا ہے، واقعی مَیں اس جُرم کا مرتکب ہوں اور مَیں توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا نہ کروں گا۔

بعض صحابہؓ چڑیوں کے بچے پکڑ لائے اور ان کی مائیں ان کے سروں پر منڈلاتی ہوئی پریشان حال اُڑ رہی تھیں۔ آپؐ نے وہ بچے چھڑوا دیئے کہ

کیوں اُنکی آزادی سلب کرتے ہو اور کیوں اُن کی ماؤں کو ستاتے ہو۔

کیڑے مکوڑے زمین میں سوراخ کرکے اپنے رہنے کا ٹھکانہ کرتے ہیں تو احادیث میں ممانعت آئی ہے کہ کسی سُوراخ کو تاک کر اس میں پیشاب مت کرو۔ اسمیں جہاں تمہاری یہ مصلحت ہے کہ اس سوراخ میں سے کوئی کیڑا مکوڑا نکل کر تمہیں تکلیف نہ پہنچاوے، وہیں اس جانور کی بھی یہ مصلحت ہے کہ بے وجہ اس کے گھر کو خراب کرکے اُسے بے گھر مت بناؤ اور اس کے ٹھکانے کو گندہ مت کرو کہ اس کا تمہیں حق نہیں۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ایک دن مدینہ سے باہر تشریف لے گئے ایک دیہاتی کے یہاں ایک ہرنی بندھی ہوئی دیکھی جو آپ کو دیکھ کر چلاّئی کہ یارسول اللہ! یہ دیہاتی مجھے پکڑ لایا ہے اور سامنے پہاڑی میں میرے بچّے بھوکے تڑپ رہے ہیں۔ آپؐ مجھے تھوڑی دیر کے لیے کھول دیجئے کہ مَیں اُنہیں دودھ پلا آؤں۔ آپؐ نے فرمایا تو وعدہ خلافی تو نہ کرے گی؟ عرض کیا یارسول اللہ! سچّا وعدہ کرتی ہوں۔ آپؐ نے اُسے کھولدیا اور وہ وعدے کے مطابق دُودھ پلا کر فوراً واپس آگئی۔ آپؐ نے اِسکے گلے میں وہی رسّی ڈالدی۔ اور اُسے بدستور باندھ دیا۔ اور پھر اس دیہاتی کو واقعہ سنا کر سفارش فرمائی کہ اُسے کھول کر آزاد کر دے۔ چنانچہ اُس نے کھولدیا اور وہ اُچھلتی، کُودتی اور حضورؐ کو دعائیں دیتی ہوئی پہاڑ میں اپنے بچوں سے جاملی۔

اس واقع سے واضح ہے کہ حضورؐ نے سب کے حقوق کی رعایت فرمائی، جانور کی رعایت تو اسکے کھول دینے سے فرمائی تاکہ ہرنی کی مامتا کی رعایت ہو

اور بچوں کو بھوکا مرتے دیکھ کر اُس کا دل نہ دُکھے۔ بچوں کی رعایت اُن کی جان بچا کر فرمائی کہ وہ ضائع نہ ہوں، انسانی حقوق کی رعایت یہ ہوئی کہ ہرنی کو اس کے واپس ہونے پر دوبارہ باندھ دیا، تاکہ واضح ہو کہ ایک انسان کو جنگل سے جانور پکڑ لانے اور اُسے پالنے یا استعمال کرنے کا حق ہے جس میں رخنہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ اور ساتھ ہی اسمیں وفائے عہد کی بھی تعلیم ہے کہ جب جانوروں تک پر وفائے عہد لازم ہے تو اس عقلمند انسان پر تو کیوں نہ ہوگا اور واضح کر دیا گیا کہ جب وفائے عہد کا ثمرہ جانور کے حق میں نجات ہے کہ ہرنی کو آزادی مل گئی تو انسان کے لیے دُنیا و آخرت میں نجات کیوں نہ ہوگی ؟

فقہائے کرام لکھتے ہیں کہ شہر کے پالتو جانوروں اور کام کاج کے حیوانات کے لیے شہر کے قرب وجوار میں لازمی ہے کہ کچھ زمینیں خالی چھوڑی جائیں جن میں کھیتی باڑی کچھ نہ ہو تاکہ جانور اس میں آزادی سے چریں اور گھاس اور پانی استعمال کر سکیں اور اُنہیں ان کا جائز حق ملتا رہے اور انکی آزادی بھی برقرار رہے۔

نیک طبیعت اور پاک نہاد انسانوں نے ہمیشہ ان جانوروں کے حقوق کی رعایت کی ہے۔ "دارالعلوم دیوبند" کے محدث حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحبؒ کھانا کھانے کے بعد روٹیوں کے چھوٹے ٹکڑے اور کنے تو چھتوں پر ڈلوا دیتے تھے کہ یہ پرندوں کا حق ہے اور کھانے کے ذرات اور بھورے چیونٹیوں کے سوراخوں پر رکھوا دیتے تھے کہ یہ اس ننھے اور ضعیف جانور کا حق ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی جانور کا دل دکھانا اور اسے ستانا ہرگز جائز نہیں۔ ایک نیک شخص محض اس لیے جہنم میں جھونک دیا گیا کہ اس نے

بلی کو کوٹھڑی میں بند کر کے بھوکا پیاسا مار دیا تھا۔ ایک فاحشہ عورت محض اس لیے جنت میں پہنچا دی گئی کہ اس نے ایک تڑپتے ہوئے پیاس سے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچالی تھی۔ جیسا کہ حدیثوں میں اس کا تفصیل سے واقعہ آتا ہے۔ شریعت اسلام نے جانوروں کے ذبیحہ میں اس کی رعایت کا حکم دیا ہے کہ ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح مت کرو کہ اس کا دل دکھے اور وہ اپنے بنی نوع کے ایک فرد کو ذبح ہوتے دیکھ کر وحشت سے خشک ہونے لگے۔

بہرحال حیوانات کے اس دنیا میں رہنے سہنے، کھانے پینے اور امن و آزادی کے حقوق ہیں۔ جن کی حفاظت کا حکم اور انکے ضائع کرنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ ہاں کوئی جانور شرّی اور موذی ہو تو اسے بے شک بند کر دینے یا مار دینے کے حقوق دیئے گئے ہیں۔ سو یہ جانور ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ شریر انسان کے لیے بھی حدود قصاص، حبس و جیل، قید و بند اور قتل و غارت وغیرہ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ موذی جانور مثل سانپ اور بچھو کو حرم میں بھی پناہ نہیں دی گئی اور قتل الموذی قبل الایذاء کا معاملہ رکھا گیا ہے۔ مگر اس سے حیوانات کے حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

جنّات کے حقوق

اسی طرح جنات بھی اس جہان کے باشندے ہیں جنکے حقوق ہیں، انہیں مکان، غذا اور امن کا حق دیا گیا ہے جسے پامال کرنیکا کسی کو حق نہیں جسطرح وہ ویرانوں میں رہتے ہیں ویسے ہی انہیں حق دیا گیا ہے کہ ہمارے گھروں میں بھی بود و باش اختیار کریں۔ احادیث سے معلوم

ہوتا ہے کہ ہر گھر میں بھی جنات بسے ہوئے ہیں۔ چونکہ وہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور ہم اپنے کام میں۔ اس لیے ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ کوئی جن ہمارے گھر میں آباد ہے۔ البتہ جو بدطینیت اور شری، فسادی ہوتا ہے اور ہمیں ستاتا ہے تو ہم کہنے لگتے ہیں کہ فلاں گھر میں آسیب کا اثر ہے اور پھر عاملوں کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ وہ عملیات سے اس جن کو بند کریں یا جلا ڈالیں۔

بہرحال جب جنات بدی پر آجائیں تو پھر ان کا مقابلہ بلکہ ان سے مقاتلہ کی اجازت بھی دی گئی ہے۔

جنّات میں مختلف مذاہب

ورنہ جہاں تک نیک اور مومن جنّات کا تعلق ہے ہمیں کوئی حق نہیں کہ اپنے گھروں سے اُنہیں نکالنے کی فکر میں رہیں۔ بلکہ ان کی طاقت اور نیکی سے خود ہمیں بھی فائدہ پہنچے گا۔ رہی بدی اور ایذا رسانی، سو وہ انسان کی بھی گوارا نہیں کی گئی چہ جائیکہ جنّات کی کی جاتی۔

بہرحال یہ واقعہ ہے کہ جنات میں ہر قسم کے افراد ہیں نیک ہیں اور بد بھی ہیں، مُسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ مشرک بھی ہیں اور یہودی و نصرانی بھی۔ چنانچہ چنانچہ قرآنِ کریم نے اس طرف کھلا اشارہ فرمایا ہے۔ حضورؐ کی بعثت سے قبل جنات آسمانوں کے دروازوں تک آجاسکتے تھے اور ملائکہ کی گفتگوؤں سے وحی خداوندی کے کچھ الفاظ اُچک لاتے تھے جس میں اپنی طرف سے جھوٹ ملا کر اپنے معتقدوں کو سناتے اور پھر غیب دانی کے دعوے کر کے مخلوق کو اپنے دام میں پھانستے۔ حضورؐ کی بعثت کے وقت ان کا آسمانوں کی طرف چڑھنا بند کر دیا گیا تو انہیں

پریشانی ہوئی کہ یہ کیا نیا حادثہ پیش آیا ہے جس نے ہم پر یہ بندش عائد کر دی۔ اور یہ کون سی نئی بات ظہور میں آئی ہے جس کی بدولت ہم پر یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے چنانچہ کچھ جنات اس وجہ کی تلاش میں نکلے اور مشرق و مغرب میں گھومے۔ کسی نے مغرب کی راہ لی اور کسی نے مشرق کی کسی نے شمال کو چھانا اور کسی نے جنوب کو۔ ان میں سے ایک جماعت کا گذر مکّہ میں ہوا تو دیکھا کہ حضور صلعم قرآن پڑھ رہے ہیں۔ اسکا طرز و انداز نرالا اور رہبرانہ دیکھکر اور یہ سمجھ کر کہ اس کی ہدایت کی زد ٹھیک ہمارے شر کے اُوپر ہے سمجھ گئے کہ بس یہی وہ بات ہے جس سے ہم پر اور ہمارے شری افعال پر یہ پابندی عائد کی گئی ہے۔ انہوں نے جاکر اپنے بھائیوں کو اطلاع دی کہ :-

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّهْدِیْ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ط (القرآن الحکیم) ۔
"ہم نے ایک عجیب قسم کا پڑھا جانیوالا کلام سُنا ہے جو نیکی کے راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے سو ہم تو اُس پر ایمان لے آئے"

جس سے معلوم ہوا کہ ان میں کافر بھی تھے جو بعد میں ایمان لائے تو اُن میں کافر و مومن کی دونوں نوعیں نکلیں۔ پھر آگے فرمایا :-

وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ط (القرآن الحکیم)
"اور ہم اب ہر گز کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ ٹھیرائیں گے"

اس سے معلوم ہوا کہ ان میں موحد و مشرک کی تقسیم بھی تھی۔ کچھ مشرک تھے اور کچھ موحد۔ آگے فرمایا :-

وَّاَنَّهٗ تَعَالٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا
"اور یقیناً ہمارے پروردگار کی شان بہت بلند ہے

اَتَّخَذَ صَاحِبَۃً وَّلَا وَلَدًا ط　　　اس سے کہ اسکے کوئی بیوی اور بیٹا ہو"۔

معلوم ہوا کہ اُن میں بعض عیسائی بھی تھے، جو عقیدۂ زوجیت اور ابنیت (یعنی اللہ کے بیوی اور بیٹا ہونیکے) قائل تھے۔ آگے فرمایا:۔

وَاَنَّہٗ کَانَ یَقُوْلُ سَفِیْہُنَا عَلَی اللّٰہِ شَطَطًا۔　　　"اور ہم میں سے بیوقوف اللہ تعالیٰ پر حد سے زیادہ جھوٹ اور افترا باندھتے تھے"۔

معلوم ہوا کہ ان میں ملحد بھی تھے جو اپنی سفاہت اور بدعقلی سے خُدا پر جھوٹ باندھ کر غیر دین کو دین باور کراتے تھے اور وحی الٰہی کے نام سے اپنے تخیلاتِ فاسدہ پھیلانے کے عادی تھے۔

بہر حال اس سے واضح ہوا کہ جنّات میں مختلف فرقے اور مختلف خیالات و عقائد کے افراد پائے جاتے ہیں تاہم اس سے ان کے قدرتی حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بدکاروں کو سزا و سرزنش کی جائے جیسے انسانوں کو کی جاتی ہے۔ لیکن انکے حقوق کو نہیں ختم کیا جاسکتا۔ حتیٰ کہ فقہاء اس پر بحث بھی کرتے ہیں کہ مسلم جن عورت سے شادی بھی ہوسکتی ہے یا نہیں؟

فقہاء کی بحث

بعض فقہاء نے اس نکاح کو جائز کہا ہے بعض نے ناجائز، جس کی نظر اس پر ہے کہ نکاح ہم جنس سے ہوتا ہے نہ کہ غیر جنس سے۔ وہ یہ نکاح جائز نہیں قرار دیتے۔ کیونکہ یہ نکاح ایسا ہی ہوگا جیسے آدمی بکری یا گائے سے نکاح کرے تو جانور بوجہ غیر جنس ہونیکے محلِ نکاح ہی نہیں اسلیئے نکاح نہ ہوگا۔

اور جن کی نظر اس پر ہے کہ جنات میں شعور ہے اور وہ شریعت کے مخاطب

اور احکام کے مکلف ہیں نیز انسانی شکل بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ وہ نکاح جائز قرار دیتے ہیں۔

بہرحال جنات کے مختلف حقوق ہیں، کچھ غذا کے حقوق ہیں، کچھ مکان کے ہیں، کچھ پڑوسی ہونے کے ہیں، یہاں تک کہ کچھ رشتۂ زوجیت کے بھی ہیں۔ ان کی رعایت لازمی ہے۔

جنات میں آنحضرت صلعم کی تبلیغ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نصیبین کے جنات کا ایک وفد آیا اور اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارے بھائیوں کی ایک جماعت فلاں جگہ جمع ہوئی ہے آپ تشریف لاکر انہیں وعظ و نصیحت فرمائیں۔ اور ان سے متعلق مسائل بیان فرمائیں۔ ان کے کچھ سوالات بھی ہیں جنکا حل چاہتے ہیں۔ حضورؐ تشریف لے گئے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ بھی ساتھ تھے۔ حضورؐ جب اس پہاڑ کے دامن میں پہنچے جس پر جنات کا اجتماع تھا تو آپؐ نے ایک دائرہ کھینچا اور حضرت عبداللہ ابن مسعود سے فرمایا کہ اس دائرے سے باہر نہ نکلیں۔ عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ عجیب عجیب قماش کے لوگ اس دائرہ کے باہر سے گزر رہے ہیں۔ لیکن دائرہ کے اندر نہیں آسکتے۔ انکی آوازیں بھی آتی تھیں۔ بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم انکے مجمع میں پہنچے اور وعظ فرمایا اور مسائل بتلائے۔ اسی میں فرمایا کہ کوئی انسان ہڈی سے استنجا نہ کرے اور وجہ یہ فرمائی کہ فانہا زاد اخوانکم من الجن (کیونکہ یہ تمہارے جنات بھائیوں کی خوراک ہے۔)

جس سے واضح ہوا کہ ان کی غذا کے حقوق کو تلف کرنا جائز نہیں پھر حدیث ہی میں ہے کہ جب آپ لوگ ہڈی سے گوشت کو کھا لیتے ہیں تو یہ ہڈیاں جنات کو "پر گوشت" ہو کر ملتی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ پہلے انسان ہڈی سے استنجا کرتے تھے جس پر جنات نے حضور صلعم سے شکایت کی تو حضورؐ نے ہڈی سے استنجا کرنے کی ممانعت فرمائی۔ جس سے جنات کے غذائی حقوق کی حفاظت ثابت ہوئی اور یہ کہ ہمیں ان کے حقوق تلف کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسی طرح مکانات سے بے وجہ انہیں اجاڑنا جائز نہیں۔ جب تک کہ وہ تکلیف پہنچانا شروع نہ کریں۔

حقوقِ ملائکہ

یہی صورت ملائکہ کی ہے وہ بھی اس مکان کے باشندے ہیں کچھ آسمانوں میں رہتے ہیں کچھ زمین میں اور ان کے بھی حقوق ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ چار انگل جگہ آسمانوں میں خالی نہیں جہاں ملائکہ نہ ہوں اور مشغول عبادت نہ ہوں، عالمِ بالا کے ملائکہ الگ ہیں اور عالمِ سفلی کے الگ اور جہاں وہ مقیم ہیں وہ ان کا مسکن ہے وہاں سے انہیں تکلیف دے کر اٹھانا جائز نہیں۔ مثلاً ملائکہ کو نفرت ہے بدبو سے اور رغبت ہے خوشبو سے، اس لیے ایسے مکانات جو ملائکہ کے اجتماع کے ہیں انہیں بدبو سے آلودہ کرنا جائز نہیں۔ مساجد ملائکہ کے اجتماع کی جگہیں ہیں تو وہاں خوشبو کا مہکانا مطلوب ہے اور بدبو سے بچانا مطلوب ہے، مساجد میں بخور اور خوشبویات کا پھیلانا شرعاً مطلوب ہے تاکہ ملائکہ کو راحت پہنچے اور پیاز کھا کر بلا منہ صاف کئے مسجد میں جانا مکروہ ہے تاکہ انہیں اذیت نہ ہو۔

حدیث میں ہے کہ مسجد میں بیٹھنے والوں کے لیے ملائکہ استغفار کرتے ہیں۔ جب تک ان کی ریاح خارج نہ ہوں اور وضو نہ ٹوٹے۔ ایسا ہوتے ہی ان کا استغفار بند ہو جاتا ہے کہ اس سے ملائکہ کو تکلیف پہنچتی ہے اور وہ ایسے بندوں سے رُخ پھیر لیتے ہیں۔ گویا ہم بدبُو سے اُنہیں ان کے مکان سے اُجاڑ دیتے ہیں جس کا ہمیں حق نہیں۔

حدیث میں ہے کہ جب آدمی جھوٹ بولتا ہے تو اُسکے منہ سے ایک خاص قسم کی بدبُو پیدا ہوتی ہے جسکی وجہ سے فرشتہ وہاں سے دُور چلا جاتا ہے اور گویا جھوٹ کی گندگی پھیلا کر اُن سے ان کا مکان چھین لیتے ہیں تو آپ کو کیا حق ہے کہ جب وہ اپنی ڈیوٹی پر ہوں اور اپنی جگہ پہ متمکن ہوں تو آپ انکو بھگا دیں اور اُن کی جگہ چھین لیں۔ البتہ جن ناپاک افراد کو پاک مکانوں میں آنے کا حق نہیں ہے انہیں نکالا جائے تو بات انصاف کی ہو گی۔ جیسے حدیث میں ہے کہ جب اذان ہوتی ہے تو شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے تو اُسے بھگا ہی دینا چاہیئے۔

بہر حال اسی طرح ملائکہ کی غذا ذکر اللہ ہے تو اس ذکر سے روکنے کی حرکت کرنا ان کی غذا چھین لینا ہے۔ جیسے پہلے آچکا ہے کہ گندگی پھیلانا یا غفلت کی باتیں کرنا جس سے انہیں تشویش اور اذیت ہو جائز نہ ہو گا۔ بہر حال ملائکہ کے حقوق بھی جنات اور حیوانات کی طرح ہیں جن کا تلف کرنا جائز نہیں۔

انسان کے حقوق

چوتھی باشعور مخلوق انسان ہے تو اللہ تعالےٰ نے اسے بھی زمین و آسمان میں حقوق دیئے ہیں۔

کھانے کا حق، لباس کا حق، مکان کا حق، آزادی کا حق، اسے بھی حق تعالےٰ

نے اس زمین پر آباد کیا ہے۔ پس ان چاروں مخلوقات حیوان، جن، فرشتہ اور انسان کا مکان ہے جس پر وہ آباد ہیں۔ ان چاروں مخلوقات سے حق تعالےٰ کا معاملہ الگ الگ ہے۔ حیوان سے جو معاملہ ہے وہ جنات سے نہیں۔ جنات کے ساتھ جو معاملہ ہے وہ ملائکہ سے نہیں۔ جن و ملک سے جو معاملہ ہے وہ انسان سے نہیں۔ مثلاً جانوروں سے یہ معاملہ ہے کہ اُنہیں قابلِ خطاب نہیں سمجھا گیا اور کوئی امر و نہی انہیں نہیں دیا۔ کوئی قانون اُن کے لیے خطابی رنگ کا نہیں اُتارا گیا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ کیونکہ ان میں فہم خطاب کا مادہ ہی نہیں۔ نہ عقل ہے، نہ فہم۔ اور ہے تو بہت ہی ادنےٰ جو مثل نہ ہونے کے ہے اور وہ بھی صرف اپنے مقاصد کے سمجھنے کے لیے ہے کہ وہ اپنی غذا، رہنے کی جگہ اور دیگر ضروریات کو سمجھ سکیں اور مہیا کریں۔ مگر وہ امور کلیہ اور اپنی تمام بنی نوع کے مفاد کلی کو سمجھنے کے لیے کوئی اہلیت نہیں رکھتے۔ صرف اپنا شخصی محدود مفاد جانتے ہیں اور بس۔

حیوانات کا مقصدِ تخلیق

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اُنہیں فہم و عقل مل جاتا تو کیا حرج کیا تھا؟ جواب یہ ہے کہ جن مقاصد کے لیے جانوروں کو پیدا کیا گیا ہے ان میں عقل و فہم کی ضرورت ہی نہیں بلکہ عقل خارج ہوتی اور وہ مقاصد کبھی پورے نہ ہو سکتے۔ ان سے متعلقہ مقاصد یہ ہیں جنہیں اس آیت میں جمع کر دیا گیا ہے۔

قرآن حکیم نے فرمایا:۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ "اور اسی نے چوپایوں کو پیدا کیا کہ ان میں تمہارے لیے

ومنافع ومنہا تاکلون ولکم فیہا جمال حین تریحون وحین تسرحون الایۃ ؎۔ (القرآن الحکیم)

جاڑے کا بھی سامان ہے اور فائدے بہت ہیں اور انہیں سے کھاتے بھی ہو اور انکی وجہ سے تمہاری رونق بھی ہے جبکہ شام کے وقت لاتے ہو اور جبکہ صُبح کے وقت چھوڑ دیتے ہو۔"

چنانچہ تم ان حیوانات کے اُون سے گرم کپڑے، پٹو اور کمبل وغیرہ بناتے ہو۔ ان کھالوں میں تمہارے لیے کئی قسم کے منافع ہیں۔ اوڑھنے کے، بچھانے کے، زینت کے، خیمے بنا کر رہنے سہنے کے" ومنہا تاکلون" اور ان میں سے تم کھاتے پیتے بھی ہو۔ یعنی ان کے گوشت سے فائدہ اٹھانے کے" ولکم فیہا جمال" حین تریحون وحین تسرحون" اور تمہارے لیے ان جانوروں میں رونق وجمال کا سامان ہے کہ تم ان سے اپنے ٹھاٹھ باٹھ اور کرّ وفر کی شانیں قائم کرتے ہو۔ سرکاری، قومی اور گھریلو تقریبات میں ان کا جلوس نکالتے ہو۔ گھوڑوں، ہاتھیوں، اونٹوں اور خچروں پر بیش قیمت زین، قیمتی ہودے اور زرّیں جھولے کس کر اپنا جاہ وحشم دکھلاتے ہو جو ایک انتہائی زینت کا مظاہرہ ہے۔

وتحمل اثقالکم الیٰ بلدلم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس۔ (القرآن الحکیم)

"اور وہ تمہارے بوجھ بھی ایسے شہر کو لے جاتے ہیں جہاں تم بدون جان کے محنت میں ڈالے ہوئے نہیں پہنچ سکتے تھے۔"

حیوانات کو عقل و خطاب سے محروم رکھنے کی حکمت

ان منافع اور حیوانات کے ان خلقی مقاصد پر غور کرو تو ان کے لیے فہم و عقل کی مطلق ضرورت نہ تھی بلکہ عقل ان میں حارج ہوتی کیونکہ اگر ان میں عقل ہوتی تو جب انسان اُن پر سوار ہوتا، زین رکھتا یا بوجھ لادتا تو عقلمند جانور کہتا کہ ذرا ٹھہریئے، پہلے یہ ثابت کیجئے کہ آپ کو مجھ پر سواری کرنے یا بوجھ لادنے کا حق ہے بھی یا نہیں؟ اب آپ دلائل بیان کرتے وہ اپنی عقل کے مطابق آپ سے بحث کرتا، تو سواری اور بوجھ تو رہ جاتا بحث چھڑ جاتی اور اگر کہیں بحث میں جانور غالب آجاتا تو آپ کھڑے مُنہ تکتے رہ جاتے بلکہ ممکن ہو جاتا کہ وہی آپ پر سواری کرتا۔

ظاہر ہے کہ یہ بڑی مشکل کی بات ہوتی۔ ہر حیوان سے کام لیتے وقت یہی مناظرہ بازی کا بازار گرم رہتا۔ نہ بیل کھیت جوت سکتا، نہ گھوڑے سواری لے جا سکتے۔ نہ حلال جانوروں کا گوشت کھایا جاسکتا نہ ان کی کھال، بال اور دانت وغیرہ سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا۔ سارے کام تجارت وغیرہ کے معطل ہو جاتے اور انسانوں کو ان حیوانوں کے مناظروں سے کبھی بھی فرصت نہ ملتی اور یہ ساری خرابی حیوانوں کو عقل و فہم ملنے سے ہوتی۔ پھر آپ کی تعلیم گاہوں میں بھی حیوانات علم حاصل کرنیکے لیے جمع ہوتے اور ایک ہی کلاس میں گھوڑے، گدھے، کتے سب جمع رہتے بلکہ جنگلوں سے شیر، بھیڑیئے، ریچھ، گیدڑ بھی جمع ہوتے تو آپکو علم حاصل کرنا وبال جان بن جاتا۔ غرض علمی اور عملی کارخانے سب کے سب درہم برہم ہو جاتے اسلئے شکر کیجئے کہ اللہ نے انہیں عقل و فہم نہ دیا جن سے آپ کے کام کاج چل رہے ہیں۔

اِس سے معلوم ہُوا کہ جس طرح عقل نعمت ہے اسی طرح بے عقلی بھی نعمت ہے حیوانات کی بے عقلی ہی سے انسان فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ حتیٰ کہ جو انسان بے عقل اور بے وقوف ہیں وہ عقلمندوں کے محکوم ہیں جس سے لیڈروں کی حکمرانی چل رہی ہے بے وقوف نہ ہوتے تو لیڈروں کو غذا نہ ملتی۔ اگر بے فہم نہ ہوتے تو لیڈری کی دکان نہ چل سکتی۔ پس کہیں عقل نعمت ہے تو کہیں بے عقلی نعمت ہے۔ اس لیے جانوروں میں مادۂ عقل نہ ہونا ہی نعمت ہے جس سے ان سے مختلف قسم کے کام بلا بحث و مجادلہ نکال لیے جاتے ہیں۔ ورنہ اگر ان میں عقل ہوتی تو یہ تمام منافع جو انسان ان سے لیتا ہے پامال ہو جاتے۔ حاصل یہ نکلا کہ جانوروں کی پیدائش سے جو مقاصد متعلق ہیں ان سے عقل کی ضرورت نہ تھی۔ اسلیئے ان کے فرائض کی وجہ سے ان کو بے سمجھ رکھا گیا تاکہ وہ انسان کی اطاعت سے مُنہ نہ موڑیں اور جب عقل و فہم ان کو نہیں دیا گیا تو ان سے خطاب کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی کہ ان کے لیے کوئی شرعی قانون اُتارا جاتا اور وہ مخاطب اور مکلّف بنائے جاتے۔ پس انکے لیے نہ امر ہے نہ نہی نہ شریعت آئی نہ کوئی تشریعی قانون۔ صرف لاٹھی اور ڈنڈا ہے جس سے وہ کام پر لگے رہتے ہیں اور روز و شب مشغول و منہمک ہیں۔

ملائکہ سے نوعیّتِ خطاب

ملائکہ کو خطاب تو کیا مگر خطاب تکلیفی نہیں کیا کہ فلاں کام کرو اور فلاں کام نہ کرو بلکہ خطاب تشریفی کیا جو اعزازی و تکریمی ہے۔ جیسے بادشاہ کسی مقرب سے باتیں کرے تو اس سے اس کی عزّت بڑھانی اور مرتبہ بلند کرنا مقصود ہوتا ہے۔ نہ کہ پابند بنانا۔ پس ملائکہ سے اللہ تعالےٰ نے خطاب کیا، کلام بھی فرمایا۔ گفتگو

بھی کی، مگر اس پر کوئی شریعت نہیں اُتاری، کیونکہ احکام دو ہی قسم کے ہوتے ہیں یا کرنے کے یا بچنے کے۔ کرنے کے کام خیر کے ہوتے ہیں جن سے خیر کا حصول مقصود ہوتا ہے اور بچنے کے کام شر کے ہوتے ہیں جس سے شر کا دفعیہ مقصود ہوتا ہے، جیسے بدکاری، دغابازی، رشوت ستانی، زناکاری، شراب خوری، چوری، سرزوری، بغاوت، تمرد اور سرکشی وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ ملائکہ میں شر اور برائی کا مادہ ہی نہیں رکھا گیا تو انہیں بچنے کا حکم دینے کی ضرورت ہی نہ تھی، وہ بدی کر نہیں سکتے تو ان میں بدی سے بچنے کا حکم دینا عاجز کو امر کرنا تھا، جو سراسر خلاف حکمت ہے اور حق تعالےٰ حلیم مطلق ہے وہ خلاف حکمت بات سے بری اور منزّہ ہے، نہ ہی خیر تو وہ ان کا طبعی تقاضا ہے، جسے وہ بہ تقاضائے طبیعت کرنے پر مجبور ہیں اور ہمہ وقت اللہ تعالےٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں مصروف رہتے ہیں، عبادت کرتے ہیں اور اپنی طبع پاک ہی سے منشائے خداوندی کو بھی پہچانتے ہیں اس لیے ان کو شریعت کے پہنچوانے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ انہیں امر خیر کرنے کے لیے کسی قانون سے تنبیہ کی جاتی۔

پس جیسے ہمارے حق میں کھانا، پینا، سونا جاگنا وغیرہ ایک طبعی بات ہے خواہ کوئی شریعت آئے یا نہ آئے انسان اس پر مجبور ہے کہ کھائے پیئے اس لیے ان امور طبعیہ پر آمادہ کرنے کے لیے کسی شریعت کی ضرورت نہ تھی اگر شریعت نہ بھی ہوتی تب بھی ہم پیاس کے وقت پانی پیتے اور بھوک کے وقت کھانا کھاتے تو جیسے ہمارے حق میں کھانا پینا طبعی بات ہے اسی طرح تمام

امورِ خیر، عبادت، نیکی، پاکدامنی، صفائے باطن و ظاہر اور سلامتی ملائکہ کے حق میں طبعی بات ہے، شریعت آئے یا نہ آئے وہ اپنے تقاضائے طبع سے ہمیشہ نیکی ہی کریں گے۔ اس لیے امورِ خیر کے لیے بھی انہیں کسی شرعی تکلیف اور قانونی خطاب کی ضرورت نہ تھی۔

بہرحال ملائکہ کو نہ امر شرعی کی ضرورت نہ نہی شرعی کی، اس لیے ان سے خطاب تکلیفی نہیں کیا گیا۔ صرف تشریفی اور تکریمی کیا گیا۔

جنّات سے نوعیّتِ خطاب

پس جانوروں سے تو خطاب ہی نہیں کیا گیا۔ ملائکہ سے خطاب تو کیا گیا مگر تکلیفی خطاب نہیں کیا گیا۔ رہے جنّات تو ان سے خطاب تو کیا گیا مگر تکلیفی خطاب ہی کیا گیا۔ مگر خطاب مستقل نہیں کیا گیا یعنی خود اُن پر براہِ راست کوئی شریعت نہیں اُتاری گئی اور نہ براہِ راست ان کی نوع کو کوئی شرعی تکلیف دی گئی۔ بلکہ انسان کے واسطہ سے ان ہی کی شریعت کا مخاطب بنایا گیا اور ان کو دین میں انسانوں کے تابع رکھا گیا۔ چنانچہ ان میں جو یہودی ہیں وہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام پر ایمان لائے، خود تورات جنّات پر نہیں اُتری۔ جو نصاریٰ ہیں وہ حضرت عیسےٰ کے متبع ہیں۔ انجیل خود ان کی نوع پر نہیں اُتری اور جو مسلمان ہیں وہ جناب رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلّم کے تابع فرمان بنائے گئے ہیں۔ خود قرآنِ پاک براہِ راست اُن پر نہیں اُتارا گیا۔ پس جو شریعت انسانوں کے لیے آئی ہے وہی ان کے لیے بھی آئی ہے۔ مگر بواسطۂ انسان انہیں پابند شریعت بنایا گیا۔

جنات میں نبوّت نہ رکھنے کی وجہ

بالفاظ دیگر ان میں نبوت نہیں رکھی گئی وجہ یہ ہے کہ جیسے ملائکہ میں خیر کا غلبہ ہے اور شر کالعدم ہے۔ جنات میں شر کا غلبہ ہے اور خیر کالعدم ہے اور نبوّت کے لیے غلبۂ خیر ہی نہیں خیر محض کی ضرورت تھی۔ ورنہ بشر کے ہوتے ہوئے بدفہمی یا بدعملی کی وجہ سے شرائع پر عمل اور ان کی تبلیغ دونوں غیر مامون ہوتیں اور صحیح دین مخاطبوں کو نہ پہنچ سکتا۔ اس لیے انہیں تابع انسان بنایا گیا تاکہ اس کی شریعت سے وہ علم وعمل کی خطاؤں سے بچنا سیکھیں۔ اس لیے جو انبیاء انسانوں میں مبعوث ہوئے ان ہی کی اطاعت ان پر لازم کی گئی۔ غرض اللہ تعالےٰ نے جانوروں کو تو خطاب ہی نہیں کیا۔ ملائکہ کو خطاب کیا مگر غیر تکلیفی اور جنات کو خطاب تخلیقی کیا۔ مگر خطاب بالاستقلال نہیں فرمایا۔

انسان کو مستقلاً خطاب

اور انسانوں کو تکلیف شرعی بھی دی اور مستقلاً خطاب بھی فرمایا۔ یعنی اپنی وحی کے ذریعے خود اُن سے کلام فرمایا۔ ان میں نبی اور رسول بنائے۔ کبھی براہِ راست خود خطاب فرمایا۔ جیسے حضرت موسےٰ علیہ السّلام سے طور پر۔ اور نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلّم سے شبِ معراج میں اور کبھی بزبان ملکی خطاب فرمایا۔ پھر فرشتہ کبھی اپنی ملکیت پر رہتا۔ اور انبیاء بشریت سے ملکیت کی طرف منتقل ہو کر فرشتہ سے ملتے اور کبھی فرشتہ اپنی صورت ملکی کو چھوڑ کر صورتِ انسانی میں آتا اور انبیاء بشری چولہ میں اُسے دیکھتے جس کو قرآنِ حکیم میں فرمایا گیا :-

وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ ما یشاء۔

(القرآن الحکیم)

"اور کسی بشر کی حالت موجودہ میں یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرماوے مگر تین طریق سے یا تو الہام سے یا حجاب کے باہر سے یا کسی فرشتے کو بھیجدے کہ وہ خدا کے حکم سے جو خدا کو منظور ہوتا ہے پیغام پہنچا دیتا ہے۔"

پہلی سورت فرشتہ کے قلب پر وارد ہونے کی ہے جس میں وہ اپنی اصلیّت پر رہتا ہے لیکن پیغمبرؐ کو بشری اصلیت سے ملکیت کی طرف منتقل ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے یہ صورت حضورؐ پر نہایت بھاری اور شدید ہوتی تھی۔ دوسری صورت حق تعالےٰ کے براہِ راست کلام فرمانے کی ہے جو پس پردہ رہ کر ہوتی تھی۔ یعنی نگاہیں حق تعالیٰ کو نہیں دیکھتی تھیں صرف کان کلام حق سنتے تھے اور تیسری صورت فرشتہ کی انسانی صورت میں آکر پیغامِ خداوندی سنانے کی ہے جس میں پیغمبر اپنی بشری اصلیت پر قائم رہتے تھے۔ فرشتہ کو ملکی چولہ چھوڑ کر بشری چولہ میں آنا پڑتا تھا۔ یہ تینوں صورتیں وحی الہٰی کی تھیں۔

علم اور وحیٔ الہٰی کے لیے انسان کا انتخاب

حاصل یہ ہے کہ وحی الہٰی اور نبوّت و شریعت کی دولت سے مخلوق میں بجز انسان کے اور کسی کا انتخاب عمل میں آیا۔ اور ظاہر بات ہے کہ وحی علم کے اُتارنے ہی کو کہتے ہیں وحی کے ذریعہ علم ہی تو رسول کو دیا جاتا ہے اس لیے دوسرے لفظوں میں علم الہٰی کی نعمت مستقلاً انسان ہی کو دی گئی ہے جس کو اس کی بنیادی خصوصیت اور امتیازی نشان سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ خصوصیّت کے

معنی یہی ہیں کہ اس کے سوا کسی دوسرے میں نہ پائی جائے۔ اسلیے دوسرے لفظوں میں انسانیت کی خصوصیّت علم وحی نکل آتی ہے اور سب جانتے ہیں کہ اگر کسی چیز کی خصوصیّت اس میں سے نکال دیجائے تو وہ چیز باقی نہیں رہ سکتی۔

اس لیے نتیجہ یہ نکلا کہ اگر انسان کو علم وحی حاصل نہ ہو تو وہ انسان انسان نہ رہے گا کہ انسانیّت کی خصوصیت اس میں نہ آئی یا نہ رہی۔ گو اس کی صُورت انسانوں جیسی ہو۔ سو ظاہر ہے کہ انسان نام انسانی صورت کا نہیں بلکہ انسانی جوہر کا ہے۔ اور انسانیت کا یہ جوہر یہ علمِ وحی ہے۔ اس لیے جو انسانی علم وحی کا حامل نہیں وہ دلائل بالا کی رُو سے انسان نہیں صرف صورت انسان ہے، اور محض صورت کی جس میں حقیقت نہ ہو، کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اگر ہم گھوڑے کا مجسمہ بالکل اصلی گھوڑے جیسا بنالیں کہ دیکھنے میں اصل و نقل میں ذرہ بھر فرق معلوم نہ ہو تو کیا اُسے گھوڑا کہیں گے؟ اور کیا وہ گھوڑے کی طرح سواری دے سکے گا؟ اور کیا اس کی قیمت بھی ہزار، پانچسو روپیہ اٹھ جائے گی؟ کبھی نہیں۔ کیونکہ وہ گھوڑا نہیں۔ گھوڑے کی محض تصویر ہے۔

اسی طرح اگر انسان کا اصلی مجسّمہ سامنے ہو مگر اس میں انسانی جوہر اور انسانی خصوصیت (علم) نہ ہو تو وہ صورتِ انسان ہے، انسان نہیں اور قدر و قیمت انسان کی ہوتی ہے صورتِ انسان کی نہیں۔ ورنہ عمدہ سے عمدہ انسانی صورتیں پلاسٹک کی بنی ہوئی چند پیسوں میں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ چاہیئے کہ انسانوں سے قطع نظر کر کے ان پلاسٹک کے انسانوں سے انسانوں کے کام لینے لگیں اور اصل انسان کے پیچھے نہ پڑیں۔ مگر ایسا نہیں ہو سکتا جس سے واضح

ہے کہ دُنیا میں قدر و قیمت انسان کی ہے، تصویرِ انسان کی نہیں اور آدمی حقیقت آدمیت کو کہتے ہیں، محض صورتِ آدمیت کو نہیں۔

گر بصورت آدمی انسان بدے   احمد و بوجہل ہم یکساں بدے
اینکہ می بینی خلاف آدم اند   نیستند آدم خلاف آدم اند
از بروں چوں گورِ کافر پر خلل!   واندروں قہرِ خدائے عزّ و جل

انسان کا ممتاز علم

یہاں ایک نکتہ فراموش نہ کرنا چاہیئے اور وہ یہ کہ انسان کی خصوصیت مطلق علم نہیں یعنی ہر قسم کے علم کو انسانی خصوصیت نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ مطلق علم یعنی علم کی کوئی نہ کوئی نوع تو قریب قریب ہر مخلوق کو حاصل ہے حتیٰ کہ جانور بھی علم سے خالی نہیں اس لیے مطلق علم انسانی خصوصیت نہیں کہلائی جا سکتی اور نہ مطلق علم سے انسان کی فضیلت و شرافت اور مخلوقات میں افضلیت نمایاں ہو سکتی ہے جب تک کہ اسے کوئی ایسا علم حاصل نہ ہو جو اس کے سوا کسی کو حاصل نہ ہو۔ آج کی دُنیا میں علم کی رائج شدہ جتنی بھی قسمیں ہیں ان میں سے کوئی بھی انسان کی خصوصیّت نہیں۔ جانوروں کو بھی ان سے حصّہ ملا ہُوا ہے اس لیے بھی انسان اپنی افضلیت اور مخلوقات میں اپنی برتری ان غیر مخصوص علوم سے نہیں جتا سکتا۔ آج اگر انسان دعوےٰ کرے کہ مَیں اس لیے افضل المخلوقات ہوں کہ مَیں انجینیری کا علم جانتا ہوں اور اعلےٰ سے اعلےٰ ڈیزائنوں کی کوٹھیاں اور بلڈنگیں تیار کر سکتا ہوں تو یہ دعوےٰ قابلِ سماع نہ ہو گا۔ کیونکہ انجنیری کے علم سے جانور بھی خالی نہیں ہیں وہ بھی دعوےٰ کر سکیں گے کہ ہم بھی انجینیر ہیں اور اپنے مناسب حال راحت دہ مکانات

بناتے ہیں۔ بیا (جو ایک چھوٹی سی چڑیا ہے) اپنے لیے عجیب و غریب قسم کا گھونسلا بناتا ہے جس میں کئی کمرے ہوتے ہیں۔ ماں باپ کا الگ اور بچوں کا الگ حتیٰ کہ اس میں بچوں کے لیے جھولا بھی ہوتا ہے جس میں بچے جھولتے ہیں۔ گویا مختلف قسم کے روم ہوتے ہیں۔ یہ گھونسلا درخت میں لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن مضبوط اتنا کہ آندھی آئے طوفان آئے مگر اس مکان پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ کیا یہ اعلیٰ ترین صنعت نہیں ہے اور یہ چڑیا کیوں یہ دعوےٰ نہیں کرسکتی کہ میں بھی انجنیئر ہوں؟ ضرور کرسکتی ہے، تو پھر انجنیئری انسان کے حق میں مخصوص کہاں رہی جو اس کی افضلیت اس چڑیا پر ثابت ہو۔ شہد کی مکھی اپنا چھتہ بناتی ہے۔ اس کے ہشت پہلو سوراخ اسقدر مساوی ہوتے ہیں کہ آپ پُر کار سے بھی اتنے صحیح خانے نہیں بنا سکتے۔ پھر اس میں بچوں کے رہنے اور پلنے کے خانے الگ اور شہد کے الگ ہوتے ہیں جو نہ بارش میں خراب ہوتا ہے نہ طوفان میں اپنی جگہ سے ہلتا ہے۔ کیا یہ انجنیئری اور کاریگری نہیں ہے؟ اگر ہے اور بلاشبہ ہے تو آپ کو کب حق پہنچتا ہے کہ آپ انجنیئری کا فن اپنی نوع کے ساتھ مخصوص بتلا کر اس مکھی پر اپنی فضیلت و برتری ثابت کرسکیں؟ سانپ اپنی بمبی مٹی سے بناتا ہے جو اوپر سے برجیوں دار گنبد کی مانند ہوتی ہے اور اسکے اندر نہایت صاف ستھری نالیاں پیچ در پیچ بنی ہوئی جن میں سانپ اور ان کے بچے رینگتے رہتے ہیں۔ کیا اسے انجنیئری اور صنعت کاری نہیں کہیں گے؟ رہا یہ کہ آپ کہیں کہ ہم عمارتیں بڑی عالیشان بناتے ہیں جن کی خوشنمائی اور نفاست ان گھونسلوں اور بھٹوں سے کہیں زیادہ اُونچی اور اعلےٰ ہوتی ہے۔ اس لیے ہم اور یہ جانور انجنیئری میں برابر

کیسے ہو سکتے ہیں ؟ تو جواب یہ ہے کہ مکان کا عمدہ ہونا مکین کی ضرورت اور راحت کے لحاظ سے ہوتا ہے، جانور اپنی ضرورت کی رعایت کرتا ہے۔ آپ اپنی ضروریات کی ۔ اگر جانور آپ کی کوٹھی کو للچائی نظروں سے دیکھتا تو آپ اپنی برتری کا دعوےٰ کر سکتے تھے ۔لیکن جیسے آپ اس کے مکان سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں وہ آپ کے مکان سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ اگر آپ سانپ یا بیا یا شہد کی مکھی کو اپنی کوٹھی میں آباد کرنا چاہیں وہ کبھی بھی آمادہ نہ ہوگا۔ بلکہ اپنا ہی مکان بنا کر رہے گا۔ اس سے واضح ہے کہ مکان کی صنعت میں دونوں برابر ہیں۔ اور اپنے اپنے رنگ کے ماہر ہیں۔ اس لیے انجنیئری کے بارے میں آپ کو دعوےٰ فضیلت کا کوئی حق نہیں ۔ اسی طرح مثلاً علمِ طب ایک تجرباتی علم ہے ۔ یہ علم جس طرح انسان کو حاصل ہے اسی طرح حیوانوں میں بھی یہ علم اپنی اپنی بساط کی قدر پایا جاتا ہے ۔ آپ یہ دعویٰ کریں کہ صرف ہم طبیب ہیں اور ہمیں ہی اس علم کا شرف حاصل ہے۔ لہٰذا ہم ہی اس فن کی رُو سے اشرف المخلوقات ہیں، غلط ہے ۔جانور بھی دعوےٰ کر سکتے ہیں کہ ہمیں ہی علمِ طب میں مہارت ہے۔ فرق اگر ہوگا تو صرف یہ کہ آپ پہ زیادہ بیماریاں آتی ہیں۔ تو آپ دواؤں کی زیادہ اقسام جانتے اور استعمال کر سکتے ہیں۔ جانوروں کو بیماریاں کم لاحق ہوتی ہیں اسلئے وہ دوائیں بھی کم جانتے ہیں۔ لیکن اس کمی بیشی کے فرق سے علمِ طب صرف آپ کی خصوصیّت قرار نہیں پا سکتا ۔

ایک چشم دید مثال

تقسیم سے قبل مجھے ایک ہندو ریاست اندر گڑھ میں بارہا جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میرے بعض

اعزہ اُونچے عہدوں پر فائز تھے۔ اس ریاست میں بندروں کے مارنے کی ممانعت تھی۔ اس لیے بندروں کی تعداد ہزاروں کی حد تک تھی۔ بندر کی جبلت میں شرارت اور چالاکی بلکہ ایذا رسانی داخل ہے اس لیے وہ کافی نقصان کرتے تھے۔ کبھی برتن اُٹھا کر بھاگ جاتے کبھی کپڑا اٹھا لے جاتے۔

اس لیے ایک بار ہم نے سوچا کہ کوئی تدبیر کرنی چاہیئے۔ اس لیے ہم نے ایک روپیہ کا سنکھیا خریدا اور اسے آٹے میں ملایا اور روٹیاں پکوا کر چھت پر پھیلا دیں تاکہ وہ کھائیں اور مرتے جائیں۔ اس لیے ہم روٹیاں چھت پر ڈال کر خود ایک گوشے میں بیٹھ کر منتظر رہے کہ اب بندر آ کر اُن روٹیوں کو کھائیں گے اور مریں گے۔ کچھ بندر آئے مگر ان روٹیوں سے دور کھڑے ہو کر دیکھنے لگے کہ یہ کیا نیا حادثہ پیش آیا کہ روٹیاں بکھری ہوئی پڑی ہیں۔ یقیناً اس میں کچھ بات ہے ورنہ روٹیاں یوں نہیں بکھیری جاسکتیں۔ اس لیے روٹی کو غور سے دیکھا پھر سونگھا۔ بالآخر انہوں نے روٹی کو ہاتھ نہیں لایا اور چلے گئے۔ ہم سمجھے کہ تدبیر فیل ہوگئی لیکن بندروں کا یہ چالاک قافلہ جاکر پھر اپنے ساتھ اور بندروں کو لایا اور چودہ پندرہ موٹے موٹے بندر ان کے ہمراہ آئے۔ اور روٹیوں کے اِرد گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ایک آگے بڑھا اور اُس نے روٹیوں کو سُونگھا۔ پھر دُوسرا آگے بڑھا اور اُس نے ایک روٹی توڑی اور اُس کے ٹکڑوں کو سُونگھا اور روٹیاں چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔

اب ہمیں یقین ہوگیا کہ یہ سب کچھ سمجھ گئے ہیں اور ہماری ساری تدبیر

ناکام ہوگئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں تقریباً ساٹھ ستر بندروں کا ایک قافلہ آیا اور ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک ٹہنی تھی جن میں ہرے ہرے پتے تھے اُنہوں نے آکر پہلے روٹیوں کو توڑا۔ ان کے ٹکڑے کئے۔ گویا پوری جماعت میں یہ اصول پیشِ نظر تھا کہ :

نیم نانے گر خورد مردِ خُدا　　بذلِ درویشاں کند نیمے دگر

بندر بانٹ تو مشہور ہے۔ آخرکار اُنہوں نے وہ ٹکڑے باہم بانٹ لیے اور ہر ایک نے ایک ایک ٹکڑا کھا کہ اُوپر سے وہ پتے چبا لیے جو ہر ایک اپنی ٹہنی ساتھ لایا تھا۔ اور دندناتے ہوئے چلے گئے اور ہم دیکھتے رہ گئے۔ اپنا آٹا بھی گیا۔ کپڑا تو پہلے ہی جاچکا تھا۔ اور اُوپر سے وقت بھی ضائع ہوا۔ اندازہ یہ ہوا کہ یہ پتے جو وہ ساتھ لائے تھے زہر کا تریاق تھے۔ جو ان بندروں کو معلوم تھا۔ اب بھی اگر آپ یہ دعوے کریں کہ طبیب صرف ہم ہی ہیں جو جڑی بُوٹیوں کی خاصیتیں جانتے ہیں تو یہ دعوے غلط ہوگا کیونکہ یہ بندر بھی دعوے کر سکتے ہیں کہ ہم بھی طبیب ہیں جو زہر خوردہ کا علاج کر سکتے ہیں اور جب یہ واضح ہوگیا جانوروں میں بھی اطباء اور معالج موجود ہیں اور وہ بھی حسبِ ضرورت دوا استعمال کر کے دکھ درد کا دفعیہ کر سکتے ہیں بلکہ پیش بندی کر کے بیماری کو پہلے ہی سے روک دیتے ہیں، تو فنِ طب میں ان کا دخل معلوم ہوا۔ پھر آپ کو خواہ مخواہ ہی دعوے ہے کہ صرف ہم ہی اطباء ہیں اور فنِ طب کی وجہ سے جانوروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ آپ اور بندر نفسِ فن میں برابر ہوگئے۔ گو کچھ خصوصیات کا فرق ہی سہی۔

فنِ سیاست بھی حیوانات میں پایا جاتا ہے

پھر اگر آپ یہ کہیں کہ طب نہ سہی فنِ سیاست سہی۔ ہم سیاست جانتے ہیں اور اپنی ملت کا نظم کر سکتے ہیں اور سیاسی نظام قائم کر کے قوم کی منظم خدمت کر سکتے ہیں۔ اس لیے ہم اس بارے میں جانوروں پر فضیلت رکھتے ہیں تو میرے خیال میں یہ دعوے بھی غلط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فن سیاست بھی انسانی خاصہ نہیں۔ بلکہ حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے۔ شہد کی مکھی بھی ملّت کی سیاسی اور انتظامی تنظیم کر سکتی ہے۔ شہد کی مکھیاں جب شہد کا چھتہ بناتی ہیں اور بے نظیر انداز میں اس میں ہشت پہلو سوراخ اور خانے بنا کر گویا اپنا یہ قلعہ تیار کر لیتی ہیں تو اس کے نظام کی تشکیل اس طرح ہوتی ہے کہ پہلے تو وہ اپنا امیر منتخب کرتی ہیں جس کا نام عربی زبان میں یعسوب ہوتا ہے۔ یہ امیر اس چھتہ پر ہر وقت منڈلاتا رہتا ہے۔ ساری مکھیاں اس امیر کی اطاعت کرتی ہیں۔ اندرون قلعہ کی انتظامی تقسیم یہ ہوتی ہے کہ اس چھتہ کے ایک حصّہ میں تو شہد بھرا جاتا ہے اور ایک حصّہ میں ان کے بچّے ان خانوں میں پلتے ہیں ایک حصّہ میں بڑی مکھیاں رہتی ہیں اور امیر ان سب کی نگرانی کرتا ہے حتیٰ کہ اگر کسی مکھی سے قوم کے خلاف کوئی غداری ہو جائے تو وہ اس مکھی کی گردن قلم کر دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ چھتے کے نیچے ہر طرف کچھ مکھیاں سر کٹی ہوئی اور ٹوٹی ہوئی پڑی رہتی ہیں۔ کسی کا سر کٹا ہوا اور کسی کی کمر ٹوٹی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مکھی کسی زہریلے پتّے پر بیٹھ کر اس کا زہریلا مادہ چوس کر آتی ہے جس سے بنے ہوئے شہد میں یقیناً سمیّت کا سرایت کر جانا

یقینی ہوتا ہے تو وہ یعسوب اسے فوراً محسوس کرتا ہے کہ زہریلا مادہ لے کر آئی ہے اور اس مکھی کی گردن توڑ کر اُسے فوراً مار گراتا ہے کہ وہ اس چھتے کے اندر نہ گھسنے پائے تاکہ اُس کے زہریلے مادے سے قوم کے دُوسرے افراد کی جانیں ضائع نہ ہوں۔ گویا وہ سمجھتا ہے کہ ایک کی جان لے کر اگر پُوری قوم کو بچا لیا جائے تو کوئی جُرم نہیں۔ یعنی اس کی سیاست اُسے یہ اصول سمجھاتی ہے کہ " ولکم فی القصاص حیٰوۃ یا اولی الالباب " یعنی ایک موت سے اگر پُوری قوم کی حیات بچ جائے تو اس موت میں کوئی مضائقہ نہیں "۔

اس قتل نفس پر مکھیوں کی اطاعت کا یہ عالم ہے کہ نہ کوئی ایجی ٹیشن ہوتا ہے نہ امیر کے خلاف مظاہرے ہوتے ہیں۔ چُپ چاپ خوش دلی سے امیر کے اس فعل قتل پر گردن جُھکا دی جاتی ہے اور کسی کو یہ خلجان نہیں گزرتا کہ یہ کیوں ہُوا ؟ بلکہ تمام قوم سر اطاعت جُھکا کر مان لیتی ہے۔ تو اولامر کا انتخاب پھر اس کے سامنے سمع و اطاعت، پھر قوم کی انتظامی تشکیل اور نظم کے تحت مکانات کی تقسیم، پھر بے راہ روی پر مجُرم کا قتل، اگر سیاست نہیں ہے تو اور کیا ہے ؟

ضلع بجنور کے ایک قصبہ نجیب آباد میں شہد بکثرت ہوتا ہے اور وہاں پر شہد کی مکھیوں کو پالنے کا خاص انتظام ہوتا ہے۔ وہاں کا ہم نے ایک محاورہ سُنا کہ فلاں نے اپنی بیٹی کو تین مکھیاں جہیز میں دیں۔ فلاں نے چار مکھیاں جہیز میں بیٹی کو دیں۔ ہمیں تعجب ہُوا کہ جہیز میں پلنگ، پیڑھیاں، میز، کرسیاں زیور، کپڑا وغیرہ تو دُنیا بھر میں دیا جاتا ہے۔ یہ مکھیاں جہیز میں دینے کے آخر

کیا نہیں؛ تحقیق سے معلوم ہُوا کہ جب وہ لوگ شہد کی مکھیاں پالتے ہیں اور کسی خاص جگہ شہد کا چھتہ لگوانا چاہتے ہیں تو اس امیر مکھی کو یعنی یعسوب کو پکڑ کر اس جگہ بٹھلا دیتے ہیں تو ساری مکھیاں وہیں جمع ہو جاتی ہیں۔ چھتہ بناتی ہیں اور وہاں شہد تیار ہو جاتا ہے۔ اس گُر کو سامنے رکھ کر وہاں کے یہ شہد کے کاروباری دو، چار امیر مکھیاں پکڑ کر اور ڈبیہ میں بند کر کے بیٹی کو جہیز میں دے دیتے ہیں۔ وہ لڑکیاں ترکیب جانتی ہیں اور مناسب مقام پر ان مکھیوں کو بٹھلا دیتی ہیں، تو وہیں شہد کے چھتے لگ جاتے ہیں۔ اور کئی کئی دھڑی شہد ہوتا ہے۔ تو چار مکھیاں جہیز میں دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چار دھڑی شہد جہیز میں دے دیا گیا۔ اس سے شہد کی مکھیوں کی اطاعت شعاری اور تنظیم پسندی معلوم ہوئی جس کی نظیر انسان میں بھی نہیں ہے۔

سو اس نظم پسندی اور تنظیم ملّت کی اعلےٰ ترین سیاست کے ہوتے ہوئے آپ کو خواہ مخواہ ہی دعوےٰ ہو گیا ہے کہ انسان ہی صرف سیاستدان ہیں۔ یہ مکھیاں بھی دعوےٰ کر سکتی ہیں کہ ہم بھی سیاستداں ہیں۔ تو اگر آپ بھی کسی امیر کے تحت رہ کر تقسیم عمل کر لیں کہ کوئی غذا مہیا کرے، کوئی تعلیم کا کام کرے۔ کوئی فوج میں بھرتی ہو کر ملک کی حفاظت کرے، تو ہر کام بلاشبہ عمدہ ہے۔ ضروری بھی ہے۔ مگر محض انسان کی خصوصیت نہیں۔ مکھیاں بھی کر سکتی ہیں۔ اس لیے یہ تنظیم کوئی وجہِ فضیلت نہیں کہ انسان اپنے کو حیوانات سے برتر سمجھے۔

بطخوں میں سیاست و تنظیم

بطخوں میں بھی سیاست پائی جاتی ہے جب بطخیں سوتی ہیں تو انکا امیر اُنکی نگہبانی اور پاسبانی کرتا ہے۔ وہ ایک ٹانگ پر ساری رات جھیل میں کھڑا رہتا ہے جب کوئی خطرہ پیش آتا ہے تو وہ آواز لگاتا ہے اور ساری قوم کو خطرے سے آگاہ کرتا ہے۔ ساری بطخیں بیدار ہو جاتی ہیں اور پَر تول لیتی ہیں اور دوسری آواز میں اُٹھکر پرواز میں آجاتی ہیں اور وہ بھی ایک قاعدے یعنی مثلث طریقے سے اُڑتی ہیں۔ امیر آگے آگے اور بطخیں دو لائن میں پیچھے پیچھے اُڑتی ہیں۔ جدھر امیر جاتا ہے اُدھر تمام بطخوں کا یہ قافلہ جاتا ہے کسی کو امیر پر اعتراض نہیں ہوتا کہ وہ اس سمت میں کیوں جا رہا ہے؟ پھر جہاں امیر بیٹھتا ہے تمام بطخیں وہیں اُتر پڑتی ہیں۔ یہ سیاست نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اس سے بہتر سیاست اور تنظیم کیا ہو سکتی ہے؟ اپنی رعایا اور ماتحت قوم کو ہر خطرے سے آگاہ کرنا اور بچانا۔ خود بیدار رہنا انکو چوکنا رکھنا کیا اعلےٰ ترین ترقی یافتہ سیاست نہیں؟

اس لیے سیاسی تدابیر اور جوڑ توڑ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اصولِ سیاست میں حیوانات بھی اسکی برابری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ مکھیاں کہیں گی کہ ہم بھی سیاستدان ہیں۔ بطخیں کہیں گی کہ ہم بھی سیاستدان ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ کی سیاست شاخ در شاخ ہے تو اسکی وجہ یہ ہے کہ ملّت میں جرائم زیادہ ہیں اسلئے روک تھام کی تدابیر بھی زیادہ ہیں۔ مکھیوں اور بطخوں میں جرائم کی انواع آپ سے کم ہے تدابیر بھی کم ہیں۔ سو اس سے کچھ ان مکھیوں اور بطخوں کی فضیلت ہی آپ پر ثابت ہوگی نہ کہ کمتری اور اصل سیاست میں برابری ثابت ہوگی، تو یہ

دعوے بھی آپ کا غلط ہے کہ ہم چونکہ فن سیاست سے واقف ہیں اسلئے افضل الحیوانات ہیں۔

مکڑی کی صنعت کاری

اگر آپ کہیں کہ ہم کپڑا بُننے کا فن جانتے ہیں لہٰذا ہم سب جانوروں میں افضل ہیں تو مکڑی آکر یہ کہے گی کہ یہ کام تو میں بھی جانتی ہوں۔ دیکھئے مکڑی سفید رنگ کا خیمہ تانتی ہے جس کی طنابیں چاروں طرف کھنچی رہتی ہیں۔ وہ اتنا صاف باریک اور ملائم ہوتا ہے کہ مانچسٹر کی ململ بھی اتنی صاف اور باریک نہیں ہوتی اور اتنا مضبوط جس کو آندھی ہوا کے سخت جھونکے اور بڑی سے بڑی بارشں بھی نہیں ہلا سکتی۔ اسکی طنابیں اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں سرکتیں۔ آپ تو سُوت سے کپڑا بُنتے ہیں وہ خدا جانے کس مادہ سے اپنا گھر بناتی ہے۔ آپ کا کپڑا پھٹ جائیگا مگر اس کا بنا ہُوا خیمہ کا یہ کپڑا اور خیمہ نہیں پھٹے گا۔ آپ کا بنایا ہُوا کپڑا میلا ہوجائیگا جسے آپ پانی سے دھوئیں گے۔ صابن سے صاف کریں گے مگر مکڑی کے اس خیمہ کے کپڑے کو صاف کرنے اور دھونے کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ کہیں گے کہ ہم اپنی غذا کے لیے پرندے پھانسنے کے لیے جال بناتے ہیں، مچھلیاں پکڑنے کے لیے جال بُنتے ہیں تو ہماری تدبیر کو کون پہنچ سکتا ہے کہ ہم غیر نوع کو قابو میں لانے کے لیے سُوت کے تاگوں سے کام لے لیتے ہیں۔ تو بھی مکڑی آگے بڑھ کر کہے گی کہ میں اس سے بہتر جال تن سکتی ہوں۔ وہ جالا تانتی ہے تو اس میں مکھیاں پھنس جاتی ہیں چلاتی ہیں مگر اس جال سے نہیں نکل سکتیں۔ تو کیا یہ غیر نوع کا قابو میں لانا نہیں اور پھر اتنا باریک تار بناتی ہے کہ آپ کا سُوت اتنا باریک نہیں ہوتا۔
غرض آپ فنون طبیعہ میں سے کون سے فن کو اپنی خصوصیت کہہ سکیں گے

ضروریاتِ زندگی کا کوئی ایسا فن نہیں جو حیوانات میں نہ ہو۔ ہم جس قدر بھی ضروریاتِ زندگی سے متعلق علم رکھتے ہیں۔ حیوانات بھی اپنی ضروریات زندگی سے متعلق سمجھ بوجھ اور صنعت کاری کا علم رکھتے ہیں۔

حتیٰ کہ اگر آپ سائنس کی مدد سے ۵۰ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر سکتے ہیں تو ایک کوا اور کرگس بھی اپنی اندرونی سائنس کی قوت سے اپنے پروں سے اتنی ہی بلندی پر پرواز کرتا ہے۔ آپ پیتل، تانبے اور دیگر معدنیات کے بنائے ہوئے مصنوعی پروں یعنی ہوائی جہازوں کے ذریعے اُڑتے ہیں اور چیل کوّے وغیرہ پرندے اپنے بنائے بنائے پروں اور خلقی طاقت سے اُڑتے ہیں۔ آپ ان مصنوعی پروں میں معدنیات کے محتاج ہیں اور ہوائی جہاز بنانے میں خون پسینہ ایک کرتے ہیں تب کہیں اُڑتے ہیں اور یہ پرندے خود ہوائی جہاز ہیں۔ غرض آپ اگر اُڑ گئے تو پرندے بھی اُڑتے ہیں۔ یعنی پرواز کا جو فعل آپ نے کیا وہی پرندوں نے بھی کیا۔ آپ نے کپڑا بن کر تن پوشی کی ہے اور بدن کو کپڑوں سے چھپایا، تو ہر پرند چرند بھی اپنی کھال اپنے پروں سے اپنے تن بدن کو چھپاتا ہے۔ آپ کا لباس مصنوعی ہے، اس کا قدرتی ہے، آپ رہنے کے لیے مکان بناتے ہیں۔ جانور بھی اپنا بھٹ اور گھونسلا بناتے ہیں۔ آپ اپنا رزق تلاش کرنے جنگل میں جاتے ہیں۔ وہ بھی اپنی غذا تلاش کرنے کھیتوں اور جنگلوں میں گھومتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ آپ پلاؤ زردہ کھاتے ہیں وہ گھاس دانہ کھاتے ہیں۔ آپ گوشت پکا کر کھاتے ہیں وہ اس

معصیت سے بری ہیں، کچا ہی کھا لیتے ہیں۔ آپ اگر ان کے گھاس دانہ سے نفرت کرتے ہیں تو وہ آپ کے زردہ پلاؤ سے نفرت کرتے ہیں۔

طبعی علوم انسان کے لیے وجہ امتیاز نہیں ہیں

غرض کوئی طبعی فن ایسا نہیں ہے جن میں وہ آپ کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکیں۔ آپ سیاست کے مدعی ہوں گے تو شہد کی مکھی اور ٹڈی سامنے آکر اس دعوئے خصوصیت کو باطل کر دے گی۔ آپ کپڑا بننے اور جال بنانے کا فن کا دعوےٰ کریں گے تو مکڑی سامنے آکر بولے گی کہ یہ کام میں بھی کر سکتی ہوں۔ آپ فنِ طب کی مہارت کا دعوےٰ کریں گے تو بندر اُچھل کر کہے گا کہ جڑی بوٹیوں کی خاصیتیں کچھ میں بھی جانتا ہوں اور میں زہر کا تریاق جانے ہوئے ہوں۔ آپ فنِ پرواز کے مدعی ہوں تو پرندے سامنے آکر کہیں گے کہ ہم فنِ پرواز میں تم سے زیادہ ماہر ہیں۔ آپ انجنیئری اور فن خانہ سازی کے مدعی ہوں گے تو ہر چرند پرند اور درندے آپ کے مقابلہ میں آکر کہیں گے کہ یہ کام ہم سب جانتے ہیں۔ رہنے سہنے، لباس پہننے، علاج کرنے، مکان بنانے اور تنظیم و سیاست کاری کرنے میں شریک ہیں تو ان فنون کی وجہ سے تو انسان ان جانوروں سے افضل نہیں ہو سکتا۔

انسان کا امتیاز

افضلیت کسی خصوصیت کی بناء پر ہوتی ہے جو اس میں ہو اور دُوسروں میں نہ ہو۔ تو حقیقت یہ ہے کہ وہ علم جو صرف انسانوں میں ہے اور اس کے سوا اور کسی میں نہیں وہ علم شرائع اور علم احکامِ خداوندی ہے جس سے اللہ کی معرفت ہوتی ہے۔ اور انسان اس علم

کے ذریعہ سعادت کے درجات طے کرتا ہے اور عنایت خُداوندی کا مستحق ٹھہرتا ہے یہ علم کسی بھی غیر انسان میں نہیں پایا جاتا۔ نہ ملائکہ میں یہ علم موجود ہے نہ جنات اس علم سے آراستہ ہیں۔ نہ حیوانات واقف ہیں اور جمادات ونباتات تو کیا واقف ہوتے؟ یہ علم خصوصیت ہے انسان کی، علم شرائع ہی صرف انسان کی وہ خصوصیت ہے جس نے اُسے سب مخلوقات پر فوقیت وفضیلت دی۔

علمِ شریعت کی حقیقت

جس کی یہ وجہ ہے کہ یہ علم بغیر پیغمبری کے نہیں آسکتا۔ کیونکہ یہ علم اللہ کی مرضیات ونامرضیات کے جاننے کا علم ہے اور کسی کی مرضی بلا اس کے بتلائے ہرگز معلوم نہیں ہوسکتی۔ اور اللہ ہر کس وناکس کو اپنے اندر کی بات نہیں بتلاتا۔ سو اس کے لیے اس نے نوعِ انسانی کو مخصوص فرمایا۔ اور اس میں بھی برگزیدہ تر طبقہ انبیاء علیہم السلام کا تھا تو اس نے انہیں اپنی مرضیات ونامرضیات سے آگاہ کیا اور بتلایا کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوتا ہوں اُسے کرو اور فلاں چیز سے ناخوش ہوتا ہوں اُسے نہ کرو یعنی امر ونہی کیا۔ پس امر ونہی کے قانون قانون کو شریعت کہتے ہیں۔ اس شریعت کے علم کے لیے نبوّت رکھی اور یہ نبوّت نوعِ بشری کے ساتھ مخصوص رکھی اور نبوّت کے علم صرف اِنسان کو دیئے۔

دیگر مخلوقات پر انسان کی برتری

یعنی چار ذی شعور مخلوق ملائکہ[۱]، جنات[۲]، حیوانات[۳] انسان[۴] میں سے یہ علم صرف انسان کو بخشا۔ باقی تین اقسام ملائکہ، جنات اور حیوانات کو یہ علم نصیب نہیں ہوا۔ یا کسی قدر ہوا تو انسان کے طفیل اور اس

کے واسطہ سے ہُوا۔ سو اس میں اصل انسان ہی رہا جس میں کوئی مخلوق اس کی ہمسری تو بجائے خود ہے شرکت کا دعوے بھی نہیں کر سکتی۔ اس سے واضح ہُوا کہ علوم طبعیہ، علوم وہمیہ، علوم خیالیہ، علوم عقلیہ وغیرہ انسان کی خصوصیّت نہیں یہ اور انواع کو بھی میسّر ہیں۔ کیونکہ یہ تمام علوم اپنی اندرونی قویٰ سے اُبھرتے ہیں اور دو قومی جانداروں میں کم و بیش سب میں رکھے گئے ہیں عقل ہو یا خیال وہم ہو یا طبیعت ہر ایک چیز میں ہے۔ اسلئے ان کے ذریعے جو تصوّر بھی جاندار کو بندھے گا اس سے خود اس کے نفس کی مرضی نامرضی اور خواہش و طلب کھُلے گی۔ خدا کی مرضی نامرضی اور خُدا کی مطلوبہ کاموں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ خدا کی پسند ناپسند اس کے اندر سے آئے ہوئے علم سے سمجھ میں آسکتی ہے اور وہی وحی کا علم ہے جو نبوّت و رسالت کے ذریعے آتا ہے اور یہ صرف انسان کو دیا گیا ہے۔ اس سے نمایاں ہو گیا کہ انسان کی خصوصیت علوم طبعیہ، علوم وہمیہ، علوم خیالیہ، علوم شیطانیہ نہیں بلکہ علومِ الٰہیہ ہیں یعلومِ نبوّت اور علومِ رسالت ہیں جو انسان کے سوا کسی کو میسّر نہیں۔ اس لیے انسان اگر ساری مخلوقات پر برتری اور فضیلت کا دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ علومِ شرعیہ کے ذریعہ کر سکتا ہے، نہ کہ علوم طبعیہ و عقلیہ و وہمیہ کے ذریعہ کہ یہ علوم انسان کے سوا اوروں کو بھی میسّر ہیں۔

دوسرے لفظوں میں نہ صرف یہی کہ اس علم سے انسان کی برتری اور فضیلت ہی ثابت ہوتی ہے بلکہ اس کی انسانیت کا مدار بھی اس علم پر ہے کیونکہ جب یہ علم ہی انسان کی خصوصیت ٹھہرا کہ یہ علم نہ ہو تو انسان اور حیوان

میں کوئی فرق نہیں، تو اس کا حاصل یہ نکلا کہ انسان اس وقت تک انسان نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس علم سے بہرہ ور نہ ہو کیونکہ جس چیز کی خصوصیت ختم ہو جائے جس سے وہ چیز، وہ چیز تھی تو پھر وہ شئے وہ شئے ہی نہیں رہتی۔ اگر آپ میں یہ خصوصیت باقی نہ رہے تو آپ آپ نہیں رہے۔ اگر خصوصیتِ انسان، انسان میں ہو تو انسان انسان کہلائے گا۔ ورنہ انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ مکان بنانے، کھانے پینے، علاج معالجہ کرنے میں انسان کے برابر ہیں۔

پس جب انسان کی خصوصیت یہ علم الٰہی ہے جس سے وہ مرضیات الٰہی سمجھ لیتا ہے تو یہ علم الٰہی جب انسان میں ہو گا تو اس کا نام انسان ہو گا ورنہ ایک کھاتا پیتا حیوان رہ جائے گا۔ کیونکہ کھانے پینے پہننے کو کتنا ہی خوشنما بنائے اور علمی رنگ میں نمایاں کرے تب بھی رہے گا جانور ہی۔ کیونکہ جانور بھی یہ علوم اپنے اندر رکھتے ہیں جیسا کہ واضح کیا جا چکا ہے۔

بہرحال یہ بات صاف ہو گئی کہ نہ کھانا انسانیت ہے، نہ پینا، نہ مکان بنانا انسانیت ہے۔ نہ سیاست و تنظیم، اگر کوئی ماہرِ فن پچاس منزل کی بلڈنگ بھی بنائے تب بھی وہ اس کی وجہ سے حیوانیت سے نہیں نکل سکتا کہ یہ کام یعنی مکان سازی اس کی خصوصیت نہیں۔ حیوانیت کی خصوصیت ہے اور اگر مکان سازی، پارچہ بافی، نظم کاری میں عقل کو بھی لگا دیا جس سے یہ اشیاء مزیّن ہو گئیں تو گو بظاہر تو وہ جانوروں سے ممتاز اور افضل ہو گیا۔ مگر حقیقت میں اُن سے اور زیادہ گھٹ گیا۔ کیونکہ عقل جیسے پاک جوہر کو اس نے اپنے طبیعت کا خادم اور غلام بنا دیا۔ اور سب جانتے ہیں کہ طبیعت بے شعور

ہوتی ہے اور عقل سرچشمۂ شعور ہے۔ تو ایک بے شعور کو باشعور کا حاکم بنا کر گویا جاہل کو بادشاہ اور عالم کو غلام کر دیا۔ یہ کہاں کی عقل ہے؟ بلکہ بدعقلی ہے۔ جانور اس بے ہودگی سے بَری ہے۔ اس لیے ایسا کر کے انسان اُونچا تو کیا ہوتا جانوروں سے کہیں زیادہ نیچا اور کم رتبہ ہو گیا کہ جانور طبع حیوانی کو استعمال کرتے ہوئے عقل کو اس کا غلام تو نہیں بناتے۔ اب خواہ ان میں عقل بالکل نہ ہو یا ہو تو نہ ہونے کے برابر ہو۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح رہے گی کہ انہوں نے طبیعت جیسی جاہل اور بے شعور حاکم کو اس کی جاہلانہ کارروائیوں کو عقل پر حاکم اور غالب نہیں بنایا۔ اور یہ انسان طبعی حرکات کرتا ہے اور عقل سے انہیں مزین بنا کر ان حیوانی حرکات کو انسانی بلکہ ملکی حرکات ثابت کرنا چاہتا ہے تو جانور سے زیادہ احمق ثابت ہُوا۔

نیز یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ طبعی تقاضوں کو پُورا کر لینا کوئی کمال کی بات نہیں۔ بلکہ طبعی تقاضوں کے خلاف کرنا کمال ہے۔ اگر کوئی کہے کہ مَیں بہت بڑا آدمی ہوں کیونکہ مَیں کھانا کھایا کرتا ہوں۔ تو لوگ کہیں گے کہ احمق یہ کون سے کمال کی بات ہے۔ جانور بھی کھانا کھاتے ہیں یہ تو طبعی تقاضا ہے۔ اس میں نہ محنت ہے نہ مشقت اور نہ ہی اس سے انسان کی کوئی جوانمردی اور جفاکشی ظاہر ہوتی ہے۔ ورنہ سارے جانور بھی فضلاء اور باکمال ہوں گے۔ یا اگر کوئی کہے گا کہ مَیں بڑا فاضل آدمی ہوں کیونکہ مَیں رات کو پڑ کر سوتا ہوں تو بھی کہا جائے گا کہ یہ تو ایک غیر اختیاری اور طبعی فعل ہے جانور بھی کر لیتے ہیں تو اس میں کمال کی بات کیا ہوئی؟

طبعی تقاضوں کی مخالفت کمال ہے

کمال نام ہے خلاف طبع کرنے کا کہ اس میں انسان کی محنت، جفاکشی اور تحمّل و صبر کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر کسی کو سُنا جائے کہ وہ مہینوں کھانا نہیں کھاتا۔ تو لوگ اسے باکمال سمجھ کر اُس کے پیچھے ہو لیتے ہیں کہ واقع میں خلاف طبع پر قابو پالینا کمال ہے نہ کہ طبع کا غلام بن کر طبعی تقاضوں کو پُورا کرلینا کمال ہے اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔

حُجّۃ الاسلام سیّدنا الامام حضرت نانوتویؒ کا بصیرت افروز واقعہ

حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند جن کا علم و فضل اور کمال ظاہری و باطنی معروف ہے ان کا زمانہ اور پنڈت دیانند سرسوتی کا زمانہ ایک ہے۔ پنڈت دیانند ہندوؤں کے فرقہ آریہ سماج کے بانی ہیں۔ انہوں نے قصبہ رڑکی میں اسلام پر اعتراضات کئے، علماء نے دندان شکن جوابات دیئے اور کہا کہ اگر جرأت ہے تو میدان میں آکر بحث کرو۔ اس نے کہا کہ تم لوگ میرے مقابلے کے نہیں، مَیں تو صرف "مولبی کاسم" (مولوی قاسم) سے بحث کرونگا۔ چنانچہ رڑکی کے علماء نے حضرت کو خط لکھا کہ ایسا واقعہ درپیش ہے آپ تشریف لائیں۔ باوجودیکہ حضرت مولانا محمد قاسمؒ صاحب بیمار تھے مگر مذہب اسلام کی حفاظت و اشاعت کی خاطر اپنے چند شاگردوں کے ساتھ رڑکی تشریف لے گئے جن میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ محدّث دارالعلوم دیوبند، مولانا احمد حسن صاحب محدث امروہی، مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری اور

دیوبند کے مشہور ادیب منشی نہال احمد وغیرہ حضرت کے خدام خاص شریک سفر تھے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ دیوبند میں کل ڈیڑھ ذہین ہے۔ پورے ذہین حکیم مشتاق احمد صاحب اور آدھے ذہین منشی نہال احمد ہیں، ان میں سے جب کوئی میرے وعظ میں سامنے بیٹھ جاتا ہے تو مضامین کی آمد شروع ہو جاتی ہے کہ سمجھنے والے موجود ہیں۔

حضرت نانوتویؒ رڑکی پہنچے تو انہوں نے منشی نہال احمد کو پنڈت دیانند کے پاس بھیجا تاکہ وہ پنڈت جی سے مباحثہ کی شرائط طے کریں۔ جب منشی صاحب پنڈت جی کی قیام گاہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ پنڈت جی کھانے کی میز پر بیٹھ چکے ہیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر بات چیت کریں گے۔ اتنے میں پنڈت جی کے لیے ایک بڑی لمبی چوڑی پرات (پیتل کی سینی) میں کھانا آیا۔ جسمیں غیر معمولی مقدار میں پوریاں، حلوا اور اسی مقدار میں ترکاری وغیرہ تھی۔ گویا آٹھ دس آدمیوں کی شکم سیری کے بقدر کھانا سینی میں دیکھا گیا جو پنڈت جی کے لیے لایا گیا تھا۔ کچھ منٹ بعد وہ پرات صاف ہو کر باہر آئی جس میں ایک حبّہ بھی باقی نہ تھا۔ منشی صاحب سمجھے کہ پنڈت جی کے ساتھ کھانے میں اور لوگ بھی شریک ہوں گے۔ کیونکہ ایک آدمی بھلا اِتنا کہاں سے کھا سکتا ہے۔ منشی صاحب کمرے میں اندر گئے تو انہوں نے دیکھا کہ اکیلے پنڈت جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے خیال کیا کہ شاید وہ لوگ دوسرے دروازے سے نکل گئے ہوں گے۔ مگر دیکھا کہ اس کمرے میں کوئی اور دروازہ ہی نہیں۔ پھر انہوں نے خادم سے پوچھا بھی کہ اس کھانے میں کیا اور کوئی بھی پنڈت جی کا شریک تھا؟

اس نے کہا کہ نہیں صرف پنڈت جی ہی نے کھانا کھایا ہے۔ منشی صاحب حیران رہ گئے کہ یا اللہ! ایک آدمی اور اتنا کھانا؟ بہرحال پنڈت جی سے مباحثہ کے متعلق گفتگو ہوئی اور منشی صاحب نے واپس آکر حضرت نانوتوی سے ساری گفتگو نقل کر دی۔

اس سلسلہ میں سُنانا یہ ہے کہ منشی جی حضرت کے پاس الگ ہو کر جب اپنے ہمجولیوں میں بیٹھے تو منشی صاحب نے کہا کہ بھائی! مجھے ایک بات کا بڑا فکر ہو گیا۔ وہ یہ کہ اگر مسائل میں پنڈت جی سے مناظرہ ہوا تو یقین ہے کہ ہمارے حضرت جیت جائیں گے کیونکہ بحمد اللہ حق پر ہیں۔ لیکن فکر یہ ہے کہ اگر کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہو گا؟ کیونکہ پنڈت جی تو پندرہ سیر کھا کے بھی ڈکار نہیں لیں گے اور ہمارے حضرت آدھی چپاتی ہی کھا کر بیٹھ رہیں گے تو بات کیونکر بنے گی؟ بات ہنسی کی تھی تمام احباب سُن کر ہنس پڑے اور بات ختم ہو گئی۔ لیکن شدہ شدہ یہ بات حضرت تک پہنچ گئی۔ تو منشی جی کو بلایا اور کہا کہ آپ نے کیا کہا تھا؟ منشی جی گھبرائے۔ فرمایا کہ بات میں سُن چکا ہوں۔ مگر پھر بھی تمہاری زبان سے سُننا چاہتا ہوں، کیونکہ مجھے اس کا جواب دینا ہے! منشی جی نے ڈرتے ڈرتے اپنا منقولہ دُہرایا۔ فرمایا۔ اس کے دو جواب ہیں۔ اول الزامی جواب ہے اور وہ یہ کہ کیا ساری باتوں کے لیے مناظرہ کو میں ہی رہ گیا ہوں۔ آخر تم لوگ کس لیے ساتھ آئے ہو؟ کھانے میں بحث ہوئی تو تم مناظرہ کر لینا۔ دوسرا جواب تحقیقی ہے اور وہ یہ کہ (حضرت نے ذرا چیں بہ جبیں ہو کر فرمایا) تم اتنے دن صحبت میں رہے تمہارے ذہن میں یہ سوال کیونکر پیدا ہوا کہ اگر کھانے

میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا؟ مناظرہ علم میں ہوتا ہے یا جہالت میں؟ کھانا بہیمیّت کی علامت ہے اور بہیمیّت جہالت کا شعبہ ہے تو کیا تم مجھے جہالت اور بہیمیّت میں مناظرہ کرانے کے لیے یہاں لائے ہو؟ اگر اس بہیمیّت میں مناظرہ ہوا تو ہم بہائم کو مقابلہ کے لیے پیش کریں گے۔ ہم پنڈت جی کے مقابلہ میں بھینسے کو پیش کریں گے، اونٹ کو پیش کریں گے اور بات بڑھی تو ہاتھی کو پیش کر دینگے کہ کھاؤ کتنا کھاتے ہو؟

پھر فرمایا کہ علم کا شعبہ ہے نہ کھانا تو تمہارے ذہن میں کیوں یہ سوال نہ پیدا ہوا کہ نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو کیا ہوگا۔ کیونکہ مناظرہ علم کے دائرہ کی چیز ہے اور اس میں مناظرہ ہوا تو انسان پیش کیا جائیگا جو ذی علم ہے اور اس کے بعد فرمایا کہ ہم اس کے لیے تیار ہیں کہ اگر نہ کھانے میں مناظرہ ہوا تو ہم کہیں گے کہ کھانا کھانے کے بعد ہمیں بھی اور پنڈت جی کو بھی ایک مقفل کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے اور چھ مہینے کے بعد کھولا جائے جو تر و تازہ نکلے سمجھئے وہی حق پر ہوگا۔

حضرت نانوتویؒ کا عروج روحانی

اس سلسلہ میں میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت نانوتویؒ نے وفات سے چند ماہ پیشتر فرمایا کہ اب مجھے بقاءِ حیات کے لیے بحمد اللہ کھانے پینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اتباعِ سُنّت کے لیے کھاتا پیتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ذکر اللہ رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے تو وہی ذریعۂ حیات بن جاتا ہے جیسا کہ انبیاء کی

شان ہے کہ وہ اظہار عبدیت اور اُمت کے لیے نمونۂ عمل چھوڑنے کے لیے
کھاتے پیتے ہیں اور وہ بھی انتہائی قلیل مقدار میں اور وہ بھی بے حد سادہ۔
جیسے جَو وغیرہ اور وہ بھی بے شمار فاقوں کے ساتھ۔ اس سے واضح ہوا
کہ طبعی تقاضوں کی مخالفت اور ان کے ترک کا نام کمال ہے جو جوانمردی
ہے۔ طبعی تقاضے پورے کر لینے کا نام کمال نہیں۔ یہ کمال تو ہر جانور
میں بھی ہے۔

ایسے ہی فنون طبیعیہ میں بڑھ جانے اور ترقی کر جانے کا نام علم
اور کمال نہیں کہ یہ طبعی علم بقدر بساط حیوانات میں بھی ہیں۔ علمی کمال یہ ہے کہ
اللہ تعالےٰ سے باتیں کر کے علم حاصل کیا جائے جو طبیعت کے تقاضوں
سے بالاتر ہے وہ علم وحی ہے جو صرف پیغمبروں کے ذریعے ہی حاصل ہو
سکتا ہے نہ کہ نفس میں خیالات پکا کر انہیں خوب صورت طریقوں سے
نمایاں کر دینے سے ملتا ہے وہ صورتِ علم کہلائے گا حقیقی علم نہیں۔
اور جب یہ علم الٰہی ہی انسانی خصوصیت ہے تو انسانیت کے معنی ہی علم
الٰہی کے حامل ہونے کے نکلے۔ اس لیے انسان نام جیسے کپڑے پہننے
گھر بنا کر رہنے اور کھانا کھانے کے نہیں۔ ایسے ہی دو کان، دو آنکھ
ایک ناک اور مخصوص صورت زیبا کے نہیں بلکہ سیرت زیبا کے ہیں جو علم لدنی
اور علم الٰہی سے بنتی ہے۔ انسان وہ ہے جس سے علم وحکمت کا چشمہ
پھوٹے یا اس چشمہ سے سیراب ہو یا اس کا حامی ہو۔ اس لیے حدیث
نبویؐ میں ارشاد فرمایا کہ :-

الدنیا ملعونۃ ملعون مافیہا الا عالم و متعلم او ماوالاہ۔ "دنیا بھی ملعون جو کچھ دُنیا میں ہے وہ بھی ملعون سوائے عالم کے یا متعلم کے یا انکے حامی اور دلدادہ کے"۔

اور وہ علم جو عالم یا متعلم سیکھتا سکھاتا ہو کتاب و سُنّت کا علم ہے۔ جیساکہ حدیث میں آیا ہے :۔

انّما العلم اٰیۃ محکمۃ او سنّۃ قائمۃ او فریضۃ عادلۃ۔ "بلاشبہ علم یا محکم آیت (قرآن) ہے یا سنّۃ قائمہ ہے یا فریضۂ عادلہ (جو کتاب و سنّت کے مشابہ ہو یعنی قیاس مجتہد)۔

اور یہ علم صرف انبیاء سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ عقل و طبع یا وہم و خیال سے۔ مگر یہ علم آتا ہے۔

عِلمِ نبوّت کے لیے ضرورت جدوجہد | محنت اور خلاف طبع مجاہدہ اور ریاضت کرنے سے

کیونکہ یہ علم علوم طبیعہ و عقلیہ کی طرح طبعی نہیں ہے اس لیے سب علوم سے افضل ہے کیونکہ امور طبیعہ کا انسان سے سرزد ہونا عجیب نہیں۔ عجیب یہ ہے کہ اس میں ایک چیز نہ ہو اور وہ آجائے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم سے صحابہؓ سے سوال فرمایا" اَیّھم اعجب ایمانا ؟ (بتاؤ کہ ایمان عجیب کن لوگوں کا ہے ؟) صحابہؓ نے جواب دیا کہ ملائکہ کا ایمان۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ ملائکہ کو کیا ہوا جو وہ ایمان نہ لائیں۔ ہر وقت تو وہ تجلیاتِ ربانی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جنت دوزخ اُن کے

سامنے ہے۔ وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو اور کون لائے گا؟ پھر صحابہؓ نے عرض کیا کہ انبیاء کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔ حضور صلعم نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام ایمان نہ لائیں گے تو کیا کریں گے؟ رات دن تو ان پر ملائکہ اُترتے ہیں۔ اللہ کی وحی اُن پر آتی ہے۔ جلال جمال خداوندی اُن کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ مُعجزات اُن کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو کیا کریں گے؟

تو پھر صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ پھر سب سے زیادہ عجیب ایمان ہمارا ہو گا؟ حضور صلعم نے فرمایا تمہیں کیا ہُوا جو تم ایمان نہ لاؤ۔ پیغمبر تمہارے سامنے ہے، معجزات تم بچشم خود دیکھتے ہو۔ وحی تمہاری آنکھوں کے سامنے اُترتی ہے۔ تم بھی ایمان نہ لاؤ گے تو اور کون لائے گا؟

تو پھر صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ و رسولہ اعلم (خدائے تعالیٰ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں کہ عجیب ایمان کن لوگوں کا ہے) تب حضور صلعم نے ارشاد فرمایا کہ ایمان عجیب ان لوگوں کا ہے جو تمہارے بعد آئیں گے۔ نہ پیغمبر ان کے سامنے ہوں گے نہ معجزات اُن کے مشاہدہ میں آئیں گے اور اُوپر سے شکوک و شبہات ڈالنے والے ہزاروں ہوں گے مگر پھر بھی وہ ایمان لائیں گے اور اس پر جمیں گے تو اُن کا ایمان عجیب ہو گا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز موانع کی کثرت اور رکاوٹوں کے ہجوم میں حاصل کی جاتی ہے تو وہی زیادہ عجیب ہوتی ہے۔ ورنہ اگر کسی چیز کے اسباب اور مؤیدات بکثرت ہوں رکاوٹ کوئی نہ ہو تو اس کا حاصل کر لیا جانا

زیادہ عجیب نہیں ہوتا اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ ملائکہ اگر عبادت میں مصروف ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کیونکہ تجلیات الٰہیہ تو ہمہ وقت سامنے ہیں اور رکاوٹیں بالکل نہیں۔ نہ ان کے پیچھے کھانے پینے کا جھگڑا، نہ بیوی بچوں کا جھگڑا، نہ بیوی بچوں کا دھندا، نہ شہوت و غضب کا قصّہ۔ تو عبادت ان کے حق میں امر طبعی ہے اور طبیعت کے تقاضوں کو پورا کر لینا کوئی حیرت ناک بات نہیں۔ بلکہ اس سے رُک جانا حیرت ناک اور عجیب ہے۔ پس جیسے انسان کے حق میں کھانا پینا سونا جاگنا عجیب نہیں۔ کیونکہ طبیعت کا تقاضا ہے ایسے ہی عبادت کرنا فرشتوں کے حق میں طبعی بات ہے جس کو بجالانا عجیب نہیں۔ عبادت اگر عجیب ہے تو انسان کے حق میں ہے کیونکہ وہ اپنی ساری نفسانی خواہشات اور طبعی تقاضوں کو پامال کر کے اور بالفاظ دیگر اپنے نفس کو قتل کر کے رکوع و سجود میں لگتا ہے۔

انسان کی عبادت فرشتوں کی عبادت سے افضل ہے

انسان کا ایک سجدہ فرشتوں کی ہزاروں برس کی عبادت سے زیادہ عجیب بلکہ افضل ہے۔ کیونکہ وہ نفس کشی پر مبنی ہے نہ کہ نفس کے تقاضوں پر وہ صبح کے وقت گرم لحاف میں سے اُٹھ کر اور خواہشات نفس کے خلاف سردی میں پانی سے وضو کر کے اور اُوپر سے اپنا گھر چھوڑ کر خدا کے گھر کی طرف دوڑتا ہے اور سجدوں میں لگتا ہے۔ نفس اُسے آمادہ کرتا ہے کہ نرم نرم بستر سے نہ اُٹھے۔ ہاتھ پیر کو وضو کے پانی سے ٹھنڈا نہ کرے، سرد ہواؤں میں سکڑتا ہوا

مسجد کی طرف نہ جائے۔

مگر وہ ان ساری طبعی خواہشات پر لات مار کر محض اپنے مالک کی رضاء کے لیے جاتا ہے اور مسجد میں پہنچ کر خداوند کریم کے حکم کی تعمیل دل وجان سے کرتا ہے۔ تو یہ مخالفت نفس ملائکہ میں کہاں ؟ اور یہ نفس کشی اور جہادِ نفس ملائکہ کو کہاں میسّر ؟ کہ وہاں نہ نفس امارہ ہے نہ ہوائے نفس ہے کہ اس کا مقابلہ کیا جائے اور جہاد کر کے نفس کو پچھاڑا جائے۔ اس کا مطلب ملائکہ کی توہین نہیں ہے۔ العیاذ باللہ۔ وہ اللہ کے مقدس بندے ہیں بل عباد مکرمون وہ اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار بندے ہیں جن سے کبھی بھی گناہ ومعصیت کا صدور ممکن نہیں۔

لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یؤمرون

ان کی توہین کفر ہے اور ان پر ایمان لانا واجب ہے۔ یہ صرف بیان حال ہے کہ ان کی عبادت بلا مزاحمتِ نفس ہے۔

انسان کی عبادت میں مزاحمت نفس ہے

اور انسان کی عبادت میں نفس سے پوری مزاحمت ومخالفت ہے۔ مقصد یہ ہے کہ طبیعت کے تقاضوں کو پورا کرنا کمال نہیں بلکہ خلاف طبیعت کرنا کمال ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسان کی طبیعت اس کی متحمل نہیں کہ اس میں علم آئے بلکہ جہالت اس کے طبیعت کا تقاضا ہے۔ اس کی جبلت میں جہل ہے علم نہیں۔ کوئی انسان ماں کے پیٹ سے ہنر لے کر نہیں آتا۔ محنت وریاضت سے ہنر پیدا کرتا ہے

طبیعت کو مار کر علم حاصل کرتا ہے جو عجیب بھی ہے اور کمال بھی۔ کمال اس لیے ہے کہ مجاہدہ سے اسے حاصل کیا، جس سے اس کے اندرونی قویٰ کی قوت اور کارگزاری نمایاں ہوتی ہے اور عجیب اس لیے ہے کہ وہ انسان جو ایک گندے قطرے سے بنایا گیا ہے۔ اور جماد لا یعقل مادہ (نطفہ) سے تیار ہُوا۔ نہ نُور سے بنا نہ نار سے۔ بلکہ پامال خاک سے جس میں شعور کا نشان نہیں اور پھر ایسا باشعور نکلا کہ دُنیا بھر پر فوقیت لے گیا۔ نُوری ملائکہ پر فائق ہُوا اور ناری جنّات پر غالب آگیا محض علم کے کمال سے۔

انسان کی کائنات سے بازی لے جانے کا سبب

تو علم کا ان گندے مادوں اور کثیف جسموں میں اُتار لینا کمال نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اور اس عجیب و غریب کمال سے اگر وہ ساری کائنات سے بازی لے جائے تو اس تامّل کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

پس ملائکہ میں اگر علم آتا ہے تو یہ ان کا طبعی تقاضا ہے اور ان کا علم اُن کے اندرون سے ہے اور اندرون سے رہتا ہے۔ اس لیے پھیل نہیں سکتا جتنا ہے اُتنا ہی رہے گا لیکن انسان مجاہدہ سے علم حاصل کرتا ہے اور جو چیز اُس کے اندر نہیں ہے وہ باہر سے لاتا ہے اور اسے علم حاصل کرنے کے لیے مشقّت و مجاہدہ کے ساتھ کتنے ہی راستے تحصیل علم کے لیے طے کرنے پڑتے ہیں اور کتنے ہی منزلوں سے گزر کر وہ علم کے مختلف درجات و مراتب اور علمی مقامات

تک پہنچتا ہے۔ اس لیے اس کا علم پھیلتا ہے اس میں تدبر و تفکر شامل ہوتا ہے۔ جس سے من بھر علم دس من ہو کر نمایاں ہوتا ہے۔

پس ملائکہ کا علم محدود قسم کا علم ہے جس میں پھیلاؤ نہیں اور انسان کا علم تدبر و تفقہ لیے ہوئے ہوتا ہے جس میں پھیلاؤ ہوتا ہے یعنی فرشتہ کو اگر چار مسئلے معلوم ہیں تو وہ چار کے چار ہی رہیں گے۔ اور انسان کو چار مسئلے معلوم ہو جائیں تو وہ تدبر و اجتہاد کے ذریعہ ان چار میں دس بیس اور مسائل ملا کر نئے نئے علوم نکال لیتا ہے۔ اس لیے ملائکہ نے بمقابلہ آدم صفائی سے خود اقرار کر لیا تھا:۔ سُبحانك لاعلم لنا الا ما علمتنا۔

انسانی علم میں تفقہ و اجتہاد

اور انسان کے استنباط اور اجتہاد کو اس کے خُدا نے سراہا کہ:۔

واذا جاءھم امر من الامن او الخوف اذاعوا بہ ولو ردّوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہُ الذین یستنبطونہٗ منھم۔	”اور جب ان لوگوں کو کسی امر کی خبر پہنچتی ہے خواہ امن ہو یا خوف تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اور اگر یہ لوگ رسول کے اور جن میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کے حوالے پر رکھتے تو اس کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو ان میں سے اس کی تحقیق کر لیا کرتے ہیں۔“

علمی لائن میں انسان کی برتری ملائکہ پر ایک تو کمیت علم کے لحاظ سے ہے کہ اسے تمام اسماء کی تعلیم ملی۔

وعلّم اٰدم الاسماء کلّھا

جو ملائکہ کو نہیں ملی اور دوسرے کیفیّتِ علم کے لحاظ سے ہے کہ ملائکہ اپنی معلومات میں تفقہ و اجتہاد سے کوئی اضافہ نہیں کر سکتے اور انسان کرتا ہے۔ پس اللہ نے انسان کو سب سے زیادہ علم بھی دیا اور اس میں زیادت علم کی صلاحیتیں بھی رکھ دیں۔

علمی ترقی صرف انسانی خاصہ ہے

پس علم اور ترقیٔ علم درحقیقت انسان ہی کی خصوصیّت ثابت ہوتی ہے جو دُوسری مخلوقات میں نہیں اور ظاہر ہے کہ کمالِ علم شاہیت کی شان ہے کیونکہ بادشاہ کا کام مزدوری کرنا نہیں بلکہ اپنی ہی مملکت کا علم رکھنا ہے تاکہ احکام دے سکے۔ اس لیے جب انسان کو سب سے زیادہ علم دیا گیا تو قدرتی طور پہ نیابت و خلافت خداوندی بھی اسی کا کام ہو سکتا تھا جو اسے مِل گیا اور اس کائنات کا سارا انتظام اس کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ نائب الٰہی بن کر اس کی کائنات پر حکم چلائے۔ کائنات سے کام لے اور اس میں حسب منشاء تصرفات کرے اس لیے وہ حیوانات سے الگ کام لیتا ہے، جمادات سے الگ بے گار لیتا ہے۔ زمین سے آسمان تک اس کے تصّرفات چلتے ہیں۔ وہ اس مادی کائنات کے مادوں میں علم کی طاقت سے جوڑ توڑ

کر کے نئی نئی ایجادات کرتا ہے اور اس طرح اپنی علم کی وسعت دیتا رہتا ہے، سب سے پہلا علم یہ ہے کہ شئی کا نام معلوم ہو کیونکہ علم میں سے نئی نئی باتیں نکالنا اور پھر عمل و صنعت میں نئی نئی ایجادات کرنا نہ فرشتوں سے بن پڑا نہ جن و حیوان سے، تو حق تعالےٰ کی ازلی عنایت اسی پر متوجّہ ہوئی۔ اور اسی کو اُس نے اپنی توجہ و عنایت سے تدریجی طور پر علم سکھلایا۔ چنانچہ علم کا بالکل ابتدائی مرتبہ شئی کا نام معلوم ہونا ہے۔ اگر نام ہی معلوم نہ ہو تو اس کی طرف توجّہ ہی محال ہے کہ مجہول مطلق کی طرف توجّہ ہو ہی نہیں سکتی۔ پس حق تعالیٰ نے اپنے سب سے پہلے شاگرد حضرت آدم علیہ السّلام کو اشیاء کے نام سکھلائے جو علم کی ابتدائی منزل ہے۔

شئی کا نام معلوم ہو جانے پر طبعاً آدمی کا جی چاہتا ہے کہ مَیں اس کو دیکھ بھی لوں، جس کا نام سُنتا آرہا ہوں۔ تو پھر حق تعالےٰ نے وہ ناموں والی کائنات دکھائی کہ جن اشیاء کے نام معلوم ہیں وہ یہ ہیں۔ اور پھر زمین و آسمان اور جو کچھ اُن کے درمیان میں ہیں انہیں پیش کیا۔ پھر اُن کے خواص و آثار بتلائے۔ پھر ان کے نتائج و غایات پر مطلع فرمایا۔ پھر ان سے کام لینا سکھلایا۔ اور پھر ان سے نفع حاصل کرنے کے طریقے سکھلائے۔ غرض درجہ بدرجہ عالم بشریت علمی ترقی کرتا رہا اور انبیاء علیہ السّلام یکے بعد دیگرے معلّم بن کر آتے رہے اور علم کے مراتب کی درجہ بدرجہ انسانوں کو تعلیم دیتے رہے۔ یہاں تک کہ جب انسانی استعداد کامل علم کی متحمل ہو گئی۔ اور

قرنہا قرن گزرنے اور علمی مشق کرنے کے بعد انسان ہمہ گیر علم کے لیے مستعد ہو گیا۔

آنحضرت صلعم پر علم اور خلافت کی تکمیل

تو آخری معلّم حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلّم کو بنا کر بھیجا جنہوں نے حقائق الٰہیہ کی تعلیم دی اور دین کو کامل کرتے ہوئے اُس کے ہر ہر حکم کی علّت اور مقصد پر مطلع فرمایا جس سے انسان نے حقیقتِ علم کا سراغ پایا اور وہ قرآن حکیم کے جامع علم سے روشن ضمیر بنا۔ پس وہ خلافت جو آدم علیہ السّلام کے دور میں اپنی ابتدائی منزل میں تھی۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم کے دور میں وہ اپنے انتہائی مقام پر پہنچ گئی۔ کیونکہ اس کا منبع علم تھا۔ علم ابتدار میں علم الاسماء کے ابتدائی دور میں تھا تو اس پر موقوف خلافت بھی ابتدائی دور میں رہی اور وہی علم جب ترقی کر کے حدِ کمال پر پہنچ گیا کہ اس کے بعد کسی نبی ہی کے آنے کی گنجائش نہ رہی۔ جو کوئی نیا علم اور نئی شریعت لے کر آئے تو خلافت بھی حدِ کمال پر پہنچ گئی۔ چنانچہ خلافت ظاہری تو حقائق کائنات کی تسخیر ہے جس کے ذریعہ عناصر اربعہ کے عجائبات نمایاں ہوں اور خلافت باطنی حقائقِ الٰہیہ کی تحصیل ہے جس کے ذریعے روحانیات کے عجائبات نمایاں ہوتے ہیں۔ سو ظاہر ہے کہ دورۂ محمدیؐ میں یہ دونوں ہی خلافتیں حدِ کمال کو پہنچ گئیں۔ ایک سے ایک محیر العقول مادی ایجادات انتہا کو پہنچ رہی ہیں جو عقل نفس کے کمال کی دلیل ہے اور ایک سے ایک

حیرت ناک علمی و روحانی اجتہادات انتہا کو پہنچے جو فقہ نفس کے کمال کی دلیل ہے۔ غرض تعقل اور تفقہ یا عقل نفسانی اور فقہ روحانی دونوں حدِ کمال کو پہنچ گئے۔ کیونکہ علم جامع دُنیا کے سامنے آگیا اس لیے خلافت ظاہری اور اسمی بھی مکمل ہو گئی اور خلافت حقیقی اور معنوی بھی تکمیل کو پہنچ گئی۔ لیکن صورت بلا حقیقت ناپائیدار اور بے معنیٰ ہے اس لیے مادی خلافت بغیر روحانی خلافت کے بے معنیٰ اور جسم بلا روح کے مانند ہے جس کے لیے نہ بقا ہے نہ پائیداری۔ اس لیے اصل خلافت وہی علمی خلافت کہی جائے گی جس سے انسان کا کامل امتیاز ساری کائنات پر نمایاں ہو گا۔ تاہم یہ دونوں خلافتیں انسان ہی کو دی گئیں۔ نہ ملائکہ کو ملیں۔ نہ جنّات وحیوانات کو۔ کیونکہ علم کا یہ مقام اور کسی کو نہیں ملا۔

ہاں! یہ علم انسان ہی میں کیوں ترقی کر سکتا تھا اور کیوں وہ بہائم یا جنّات یا ملائکہ میں ترقی پذیر نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ بھی دونوں قسم کی خلافتوں کے مستحق ہو جاتے۔ سو اس کی بناء یہ ہے کہ علم کی ترقی ہو۔ یا صنعت وعمل کی۔ بغیر تصادم اور ٹکراؤ کے نہیں ہوتی۔ بلکہ ترقی نام ہی ٹکراؤ اور تصادم کا ہے۔ اس کے بغیر علم اور قدرت کے مخفی راز آشکارا نہیں ہو سکتے۔

مادی ترقی کی اصل حقیقت تصادم و ٹکراؤ کا نتیجہ ہے

کیونکہ یہ ایک فطری اصول ہے کہ خالی مادہ میں ترقی نہیں ہوتی جب تک کہ اسے اس کے مخالف سے

ترکیب دے کر ٹکرایا نہ جائے۔

مثلاً محض آگ میں کوئی ترقی نہیں ہے۔ جس طرح ہزاروں سال پہلے وہ جلتی اور بھڑکتی تھی۔ اسی انداز پر آج بھی جلتی اور بھڑکتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہزار دس ہزار برس کے بعد اس کی لپٹ اور رنگ نے ترقی کر کے کوئی نئی صورت یا جدّت پیدا کر لی ہو۔ اس کے کسی انداز میں نہ اضافہ ہے نہ ترقی۔ اسی طرح محض پانی میں کوئی ترقی نہیں۔ سمندر کئی ہزار سال پہلے جس طرح ٹھاٹھیں مار کر اُچھل کود کرتا تھا اسی طرح آج بھی کر رہا ہے۔ نہ اس کے تموّج نے کوئی جدّت پیدا کی نہ جزر و مدر نے۔ وہی تموّج آج بھی ہے جو دس ہزار سال پہلے تھا۔ نیز سمندر بھی وہیں کا وہیں ہے۔ جہاں پہلے تھا۔ کوئی رُخ تبدیل نہیں کیا۔ نہ اُس کا رُخ بدلا نہ ہی دھارا تبدیل ہوُا۔ اسی طرح ہوَا جیسے پہلے چل رہی تھی اب بھی اسی انداز سے چل رہی ہے۔ زمین جیسے پہلے ایک تودۂ خاک تھی، اب بھی ہے۔ نہ اس میں کوئی جدّت ہے نہ ندرت ہے، نہ ترقی اور نہ ارتقاء ہے۔

لیکن اگر ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے مِلا کر ٹکرا دو تو وہیں ترقی شروع ہو جائے گی۔ مثلاً پانی کو ایک برتن میں بھر کر اور بیچ میں ایک پردہ دے کر دوسری جانب آگ دہکا دیں کہ جس سے آگ پانی پر حملہ آور ہو اور پانی آگ پر یعنی وہ اُسے ٹھنڈا کر دینا چاہے اور یہ اُسے گرما دینا چاہے تو ان دونوں کے ٹکراؤ سے ایک تیسری چیز پیدا

ہو جائے گی جسے بھاپ یا اسٹیم کہتے ہیں اور اس سے کلیں اور مشینیں چلنے لگیں گی اور تمدنی ترقی شروع ہو جائے گی۔

اگر آگ کو پانی سے ٹکر نہ دی جاتی تو محض آگ یا محض پانی سے کوئی انجن یا مشین نہ چل سکتی۔ تو یہ تمدنی ترقی دو عنصروں کے تصادم اور ٹکراؤ کا نتیجہ ہے جو تنہا تنہا ایک ایک عنصر سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح اگر ہوا کو آگ سے ٹکرا دیا جائے اور فضاء میں مثلاً آفتاب کی گرمی سے برسنے والی آگ ہوا کے جھکولوں سے متصادم ہوتی ہے تو شہاب ثاقب اور گرجنے والے رعد و برق پیدا ہوتے ہیں جن سے فضاء میں عجائبات نمایاں ہوتے ہیں اور ساکن فضاء میں نئے نئے حوادث رونما ہوتے ہیں جو محض آگ یا محض ہوا سے نمایاں نہیں ہو سکتے تھے۔

اسی طرح مثلاً مٹی اور پانی کو ملا دیا جائے کہ مٹی تو پانی کے سیلان اور رقت کو ختم کر دینا چاہے اور پانی مٹی کے جماؤ کو اور انجماد کو مٹا دینا چاہے تو ان دونوں کی ٹکر سے گارا پیدا ہو جائے گا اور اس سے اینٹیں بننے لگیں گی جن سے مکانات کی تعمیر ممکن ہو گی۔ پھر اس گارے سے برتن بننے لگیں گے جن سے تمدن کی ترقی ہو گی اور نئے نئے ڈیزائن کے ظروف و مکان اور سامان کے تیار ہو جائیں گے۔ اگر تنہا مٹی اور پانی اپنی اپنی جگہ پڑے رہیں تو یہ ترقی کبھی بھی رونما نہ ہو۔ اس سے واضح ہوا کہ ترقی نام تصادم کا ہے۔ تصادم نہ ہو تو ترقی بھی نہ ہو۔

ان بے شعور چیزوں کو چھوڑ کر باشعور کو لو تو دو پہلوان مثلاً فنِ کشتی و

سپہ گری کے ماہر ہوں۔ لیکن کبھی زور آزمائی نہ کریں اور کبھی باہم کشتی نہ لڑیں تو اُن کے فن اور داؤ پیچ میں کوئی اضافہ نہ ہو گا۔ لیکن اگر ان دونوں پہلوانوں کو باہم ٹکرا دیا جائے اور وہ کشتی لڑ پڑیں تو ہر ایک کوشش کرے گا کہ وہ دوسرے کے داؤ کی کاٹ کرے تاکہ مغلوب نہ ہو تو ہر وقت نئے سے نیا داؤ اپنے فنی قواعد کے تحت ایجاد کرے گا اور اس طرح فن کے مخفی گوشے کھل کر فن ترقی کرے گا اور دُنیا کے سامنے نئے نئے داؤ پیچ کھلتے رہیں گے۔ اگر پہلوانوں کا یہ تصادم اور ٹکراؤ نہ ہوتا تو فن سپہ گری کے راز نہ کھل پاتے۔

علم وجہل اور حق و باطل کے تصادم کی حکمت

تو اسی طرح ایک عالم کتنا ہی بڑا علم رکھتا ہو اس میں خود بخود کوئی اضافہ نہ ہو گا لیکن اگر اس عالم سے کسی جاہل کو لڑا دو جو اس پر اعتراضات اور سوالات کی بوچھار کر دے تو اس کے علم میں سے نئے نئے گوشے جوابوں کی بدولت پیدا ہو جائیں گے جن سے اس کے علم میں زیادتی ہو گی جو بغیر اس علم و جہل کی ٹکر کے کبھی نہ پیدا ہوتی۔

اسلام حق ہے اس کا علم اور قانون سچّا ہے لیکن اگر اُس کے مقابلہ پر کفر نہ ہو اور وہ اس سے ٹکّر نہ لیتا ہو تو اسلام کی قوتوں کے مخفی گوشے اور اس کی حقائق کے سربستہ راز جو اس میں پنہاں ہیں کبھی نہ کھل سکتے اور نہ ہی اس کی قوّت نمایاں ہو سکتی۔ اس لیے

حق تعالیٰ نے اسلام کے مقابلہ پر کفر اخلاص کے مقابلہ پر نفاق ۔ سچ کے مقابلے پر جھوٹ ۔ علم کے مقابلہ پر جہل ۔ دیانت کے مقابلے پر خیانت ۔ ملائکہ کے مقابلہ پر شیاطین ۔ انبیاء کے مقابلے پر دجال رکھدیئے کہ یہ اضداد ان اصول سے ٹکراتی رہیں اور اس طرح ان کی پاکیزہ قوتیں اس ٹکراؤ سے نمایاں ہو کر ان کی صداقت کھولتی رہیں ۔

قوموں کے مقابلوں میں درسِ عبرت

اسی طرح وہ قومیں کتنی جاہ و جبروت کی حامل ہی کیوں نہ ہوں لیکن اگر دوسری قوموں سے اُن کی ٹکّر نہ ہو تو ان کے مخفی جوہر جو مقابلہ ہی کے وقت کُھل سکتے ہیں کبھی نہ کُھلیں ۔ اس لیے جب دو قومیں لڑتی ہیں تو غالب و مغلوب کے ملنے سے نئے نئے نظریات اور نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں تاکہ دُنیا کی وہ ترقیات جو عقلِ انسانی اور علمِ روحانی سے وابستہ ہیں اپنے وقت پر ان تصادموں سے نمایاں ہوتی رہیں اور ہر قوم کے دماغی اور قلبی جوہر کھل کر وہ اگلی نسلوں کے لیے مزید ترقیات کا درسِ عبرت بنیں ۔ ورنہ ہر قوم ماءِ اکد (ٹھہرے ہوئے پانی) کی طرح سڑ کر اپنے جوہروں کو نہ کھو دے ۔ اور اقوام میں اس بے فکری سے سستی کاہلی اور تن آسانی پیدا ہو جائے ۔ اور عالم میں فساد نمایاں ہو جائے ۔

اس لیے اقوام کو ٹکرا کر ایک دوسرے کے لیے تازیانہ عبرت بنا دیا جاتا ہے تاکہ بے فکری سے اپنی خلقی جوہروں کو ضائع نہ کرنے

پائیں۔ اس لیے قرآن حکیم نے اقوام کے تصادم کو خدا کے فضل وکرم سے تعبیر کیا ہے کہ اس کے بغیر نہ کائنات کے سربستہ راز ہی واشگاف ہو سکتے ہیں۔ نہ اقوام میں بیداری اور مستعدی ہی پیدا ہو سکتی ہے جو قدرت نے اس میں ودیعت فرما رکھی تھی۔ فرمایا :۔

ولولا دفع الله النّاس	اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بعضے آدمیوں
بعضهم ببعض لفسدت	کو بعضوں کے ذریعہ سے دفع کرتے رہا
الارض ولکن الله	کرتے ہیں تو سرزمین (تمام تر) فساد سے پُر
ذو فضل علی العالمین۔	ہو جاتی لیکن اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے
	ہیں جہان والوں پر ۔

ٹھیک اس طرح سمجھو کہ انسان کے سوا کائنات کی تین باشعور کائنات ایک ایک جوہر کی حامل ہیں ۔ حیوانات میں صرف بہیمیت ہے ۔ جنّات میں صرف شیطنت ہے اور ملائکہ میں صرف ربانیت ہے۔ اسی لیے ان میں سے کسی میں بھی ترقی نہیں۔ کوئی محض آگ کی مانند ہے جیسے جنّات کوئی محض ہوا کی مانند ہے جیسے ملائکہ۔ کوئی محض پانی یا مٹی کے مانند ہے جیسے بہائم ۔

سو نہ جنّات میں کوئی ارتقائی شان ہے۔ کسی جن نے نہ آج تک کوئی ایجاد کی جس سے دُنیا میں سجاوٹ پیدا ہو جاتی نہ کسی فرشتہ نے آج تک کوئی اجتہاد کیا کہ نیا طریقہ اور نئی شریعت پیدا ہو جاتی۔ نہ کسی جانور نے آج تک کوئی نیا راستہ نکالا جس سے دنیا کو کوئی رہنمائی ملتی۔

جنّات و شیاطین جس طرح ہزاروں برس پہلے حیلہ و فریب اور فساد انگیزی کرتے تھے اسی نوعیّت کا آج بھی کرتے ہیں۔ بہائم کھانا، پینا، چرنا اور نسل بڑھانا جیسے پہلے کرتے تھے وہی آج بھی کرتے ہیں۔ نہ بیل کے گھاس کھانے کا اور نہ نر و مادہ کے ملنے کا کوئی جدید طریقہ نکلا۔ نہ فرشتوں کی نیکی کرنے کا کوئی نیا راستہ نکلا۔ نہ شیاطین کے مکر و فریب میں کوئی جدّت پیدا ہوئی بلکہ ہزاروں سال پہلے ان انواع کے جو طبعی افعال تھے وہی کے وہی آج بھی ہیں۔ ان میں کوئی ترقی نہیں کیونکہ یہ سب نوعیں اپنے اندر ایک ہی ایک مادہ رکھتی ہیں اور ان کے اندرون میں تصادم کی کوئی صورت نہیں جو ترقی کی بنیاد تھی۔

انسان میں ملکیّت بہیمیّت شیطنت تینوں ہیں

بخلاف انسان کے کہ اس میں اللہ تعالےٰ نے یہ ساری قوتیں جمع فرما دیں اس میں ملکیّت بھی ہے بہیمیت بھی ہے اور شیطنت بھی ہے تو لازمی تھا کہ یہ متضاد قوتیں باہم ٹکرائیں اور اس ٹکراؤ سے نئے نئے افعال کا ظہور ہو جو صرف ایک قوت سے نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً بہیمیت کا کھانا پینا اور نسل بڑھانا تھا۔ لیکن جب اس کے ساتھ ملکیّت ٹکرا جاتی ہے تو تیسری قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کو عفت اور پاکدامنی کہا جاتا ہے اور اس سے جائز و ناجائز کی سینکڑوں صورتیں پیدا ہوتی ہیں کہ فلاں کھانا جائز ہے اور فلاں حرام۔ فلاں نسل کشی حلال اور فلاں حرام۔ فلاں چیز پینی جائز اور فلاں ناجائز۔ غرض تدین

کے ہزاروں گوشے عفّت و پاک دامنی کی بدولت کُھلتے ہیں جس سے دین و دیانت ترقی کرتے ہیں اور عفّت درحقیقت بہیمیت اور ملکیّت کے ٹکراؤ کا نتیجہ ہے جیسے آگ اور پانی کے ٹکراؤ کا نتیجہ بھاپ تھا۔ جس سے تمدّن ترقی کرتا تھا۔ اسی طرح شیطنت کا کام دھوکہ، فریب اور دغابازی ہے۔ اس کے ساتھ اگر ملکیّت کی عقل لڑا دو تو تدبیر و تدبّر پیدا ہوگا۔ جس سے مکر و فریب کے بجائے عقل خیز تدابیر کا ظہور ہوگا۔ اور حملہ آوری اور بچاؤ کے نئے نئے نظریات سامنے آئیں گے۔

درندوں میں قوتِ غضبیہ ہے جس کا ثمرہ تخریب اور چیر پھاڑ ہے۔ لیکن اگر اس کے ساتھ ملائکہ کی متانت و بردباری کو ٹکرا دیا جائے تو اس سے شجاعت پیدا ہوتی ہے جس میں عقل و ہوش کے ساتھ جوش دکھایا جاتا ہے اور بہادری کے ساتھ دانائی کا استعمال ہوتا ہے۔ بہرحال شہوت، غضب اور مکر و فریب کے ساتھ اگر قوتِ عقلیہ کو لڑایا جائے تو اس سے پاکیزہ اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور علمی اخلاقی اور دینی ترقیات کے دروازے کُھل جاتے ہیں جو صرف انسان ہی سے ممکن ہیں۔ جن و ملک اور حیوان سے ممکن نہیں۔ کیونکہ متضاد قوتوں کا مجموعہ انسان ہی ہے اس لیے ترقی کی راہیں بھی انسان ہی پر کھل سکتی ہیں۔ نہ کہ ان تین مخلوقات پر۔ اس لیے اگر ایجادات سے دُنیا کو سجایا تو انسان نے سجایا۔ ریل، تار، فون، بجلی، اسٹیم، جہاز، کشتی سواری، مکان، ظروف، تجارت، حرفت، حکومت۔ انسان کے سوا کسی نے کرکے

نہیں دکھلائی اور ادھر اجتہادات اور نقل و روایت کا میدان یعنی دین، شریعت طریقت، مشرب، ذوق وجدان، تجربہ، علم، معرفت، قرب، طاعت، بصیرت بھی انسان کے سوا کوئی حتیٰ کہ پاکباز فرشتے بھی میسر نہ کر سکے۔ یعنی انسان اس ترقی اور ان متضاد مادوں کے ٹکراؤ سے پیدا شدہ ارتقاء کی بدولت فرشتوں سے کہیں زیادہ اونچا پہنچا اور جبرائیلؑ کی رسائی سے بھی آگے تک اس کی رسائی ہوئی جہاں ملائکہ پر بھی نہیں مار سکتے۔ یہ اس کے قوتِ عقلیہ کے قوت شہوانیہ، قوت غضبیہ، قوتِ حیوانیہ سے ٹکراؤ اور عقل کے غلبہ کا نتیجہ ہے۔

ہاں اگر اس ٹکراؤ میں عقل مغلوب ہو جائے اور یہ قوتیں بمقابلہ عقل کے غالب آجائیں یعنی عقل ان مادوں کی خادم بن جائے اور ان کے تقاضوں کو اپنی تدبیر سے پورا کرنے والی نوکر بن جائے تو پھر یہ بہائم سے چار ہاتھ آگے کا بہیمہ اور شیاطین سے درجوں اوپر کا شیطان بن جاتا ہے جس سے بہائم اور شیاطین بھی پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ اگر اس کی عقل بہیمیت کا آلہ کار بن جائے تو بہائم کو وہ عیاشی اور بدکاری نہیں سوجھ سکتی جو اسے سوجھے گی۔ یہ زنا اور سیاہ کاری کی ایسی نئی نئی شکلیں بھی اختیار کرے گا جو بہائم کو ہرگز نہیں سوجھ سکتیں۔ اس کے یہاں عیاشی کے اڈے بن جائیں گے، زنا کے چکلے تیار ہو جائیں گے۔ فحاشی ایک فن اور ایک ہنر بن جائے گی اور حیوانات کے خواب میں بھی وہ حیوانیتیں نہ آئیں گی جو اس کا فحاش دماغ اور عیاش دل اختراع کرے گا اور اگر اپنی عقل کو

مکر و فریب کی قوتوں کا غلام بنا دیا تو پھر اُسے وہ حیلے اور جعلسازیاں سُوجھیں گی کہ شیطان کو صدیوں غور کر کے بھی نصیب نہ ہوگی۔ غرض ان خلقی قوتوں کے ٹکراؤ میں اگر عقل غالب رہی تو یہ اپنی برتری کا ثبوت پیش کریگا۔ اور اگر عقل پر شہوت و غضب اور درندگی غالب آگئی تو یہی انسان انتہائی پستیوں میں گرا ہوا نظر آئے گا۔ لیکن غور کرو تو یہ عقل ان قوتوں پر علم کے ہتھیاروں ہی سے غالب آسکتی ہے۔

بلا علم کی عقل محض عقل طبعی ہے جو بلاشبہ ان ہی طبعی قوتوں کا ساتھ دے گی اور اُنہیں اپنا کام کرنے کے لیے نئے راستے بھی بتلائے گی لیکن عارف و عالم عقل جسے علم نے چمکا دیا ہو ان قوتوں کو اپنی راہ پر چلائے گی۔

عقل کو ربانی علوم کا تابع ہونا چاہیئے

اور پھر ہر شعبۂ زندگی میں انسانی کمالات کا ظہور ہو گا۔ اس لیے انسان کی فضیلت ان تینوں باشعور مخلوقات پر عقل محض سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ علم سے ثابت ہوتی ہے اور علم بھی وہ جو طبعی بھی نہ ہو اور کورا عقلی بھی نہ ہو۔ بلکہ ربانی علم ہو جو بذریعہ وحی کے ذات حق کی طرف سے آتا ہے اور دلوں کو روشن کرتا ہے۔ عقلوں کو جِلا دیتا ہے ذہنوں کو رسا کرتا ہے۔ دماغوں کو صیقل کرتا ہے اور بالفاظ دیگر آدمی کو آدمی بناتا ہے۔ ورنہ :

ع آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

اس لیے ہمارا فطری اور عقلی فرض ہو جاتا ہے کہ ہم اس شرعی اور الٰہی علم کو حاصل کریں جس سے ہماری روشنی وابستہ ہے اور ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر گوشے میں اسی علم سے ہدایت حاصل کریں۔ یعنی خلوت اور جلوت ، انفراد اور اجتماع ، دوستی اور دشمنی ، حکومت اور غلامی خوشی اور غمی ، راحت اور مصیبت ، موت وحیات ہر مرحلہ پر اسی علم سے جس کا دوسرا نام شریعت ہے ، رہنمائی حاصل کریں اور اپنی عقل کو اس کے خادم کی حیثیت سے ساتھ رکھیں ۔ یہی قوتیں جو جہالت کے ساتھ عیاشی ، فحاشی ، بدکاری اور بے ایمانی پر لاتی تھی ۔ اب شریعت کے تابع ہو کر عفت ، عصمت ، پاکی ، پاکدامنی اور نیکوکاری پر لے آئیگی۔ وہی قوت شیطنت جو بحالتِ جہل مکاری ، ڈپلومیسی ، عیاری اور شرارتوں کی طرف لاتی تھیں ۔ اب تابع فرمانِ الٰہی ہو کر تدبیر ، دانائی ، دانش وبینش اور عاقبت شناسی کی طرف لے آئے گی اور بالفاظ دیگر نفس پرستی سے نکال کر فطرت روحانی اور خدا ترسی کی طرف نکال لائیگی۔ اس لیے خلاصہ یہ ہوا کہ طبیعت پر تو حکومت عقل کی قائم کر دیجائے اور عقل پر حکمرانی شریعت اور علم الٰہی کی قائم کر دی جائے تو انسان مزکّٰی ، مصفّٰا اور مجلّٰی ہو جائے گا۔

اسلام کے دینِ فطرت ہونیکے معنی

ورنہ ایک حیوان یا ایک شیطان یا ایک درندہ کے سوا کچھ نہ ہو گا

اس کا حاصل یہ نکلا کہ شریعت انسان کے کسی خلقی مادہ کو ضائع یا پامال کرنے کے لیے نہیں آئی بلکہ ٹھکانے لگانے کے لیے آئی ہے تاکہ ہر قوت کو اس کا صحیح مصرف بتلا کر اس میں استعمال کرائے۔ یہی معنی ہیں اسلام کے دینِ فطرت ہونے کے کہ اُس نے ہر قوت کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ شہوت ہو یا غضب۔ درندگی ہو یا شیطنت کسی کو بھی ضائع نہیں ہونے دیا ہے بلکہ ایک خاص پروگرام پر چلا دیا ہے۔ نیکی تو بجائے خود ہے اس نے تو کسی بدی کو بھی بالکل نہیں مٹایا بلکہ اپنے اشاروں پر چلایا ہے۔ مثلاً جھوٹ گناہِ کبیرہ ہے۔ انسان کی جبلّت میں جوش کے وقت مبالغہ آمیزی اور خلاف واقعہ کلام کر جانا داخل ہے۔ شریعت نے اسے کلیتہً نہیں مٹایا۔ بلکہ فرمایا کہ اگر دو لڑتے ہوئے بھائیوں میں جھوٹ بول کر بھی صُلح کرادو تو نہ صرف کہ یہ جائز ہے بلکہ اس پر اجر بھی ملے گا اور ایسا اجر جو نماز روزے پر ملتا ہے۔

دو بھائی باہم لڑ رہے تھے آپ نے ایک بھائی کے پاس جاکر کہدیا کہ تم کس کا مقابلہ کر رہے ہو وہ تو تمہاری جُدائی سے بے حد غمگین او سوگوار ہے اور رات تو وہ آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھا او روتا تھا کہ ہائے میرا بھائی مجھ سے جُدا ہو گیا۔ اُدھر دُوسرے بھائی کے پاس گئے اور اس سے بھی ایسی ہی باتیں کہیں جس سے دونوں کے دل نرم ہو گئے اور مصالحت کو آمادہ ہوئے اور صبح کو دونوں نے معانقہ کر کے باہم صلح صفائی کر لی تو اس جھوٹ پر ثواب اس سچ کی نسبت یقیناً ملے گا جس سے فتنہ

کا بیج بو دیا جائے اور دو ملے ہوئے بھائیوں کو لڑا دیا ہو۔ اس سے واضح ہے کہ جھوٹ جیسی چیز کو بھی شریعت نے مٹایا نہیں بلکہ محفوظ رکھ کر اپنے اشاروں پر چلایا ہے۔ گویا معصیت بھی عبادت بن جاتی ہے۔ اگر شریعت کے اشاروں سے ہو اور اگر حق کو شریعت کے خلاف استعمال کیا جائے تو وہ معصیت بن جاتا ہے۔ غیبت سچ بولنے کو کہتے ہیں یعنی کسی واقعی عیب کو اس کی پس پشت بیان کرنے کا نام غیبت ہے۔ شریعت نے اس سچ کی ممانعت فرمائی اور اسے حرام رکھا حالانکہ غیبت سچی بات کو کہتے ہیں اور جھوٹ ہو تو وہ افترا ہو گا غیبت نہ ہو گی تو یہ سچ بولنا حرام ہے۔
ارشاد خداوندی ہے :۔

ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتاً فکرھتموہ ۔	کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اسکو تو تم ناگوار سمجھتے ہو۔

یعنی غیبت کرنا ایسا گندہ فعل ہے جیسے اپنے بھائی کا مردار گوشت نوچ نوچ کر کھانا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ سچ عبادت ہے اور نہ جھوٹ معصیت۔ بلکہ کہنا ماننا عبادت ہے اور نہ ماننا معصیت ہے۔ نماز عبادت ہے مگر پانچ وقت میں فرض ہے انہیں ترک کر دو تو معصیت ہے لیکن یہی نماز تین اوقات میں حرام ہے۔ سورج طلوع ہوتے وقت، غروب ہوتے وقت اور استوار یعنی سورج کے سر پر ہوتے وقت ان اوقات میں اگر نماز پڑھے گا تو گنہگار ہو گا۔ معلوم ہوا کہ نہ نماز پڑھنا عبادت ہے نہ چھوڑنا عبادت ہے بلکہ کہنا ماننا ہی

عبادت ہے۔ ماہِ رمضان میں روزہ فرض ہے۔ اگر بلا عُذر ترک کیا جائے تو گناہ اور سزا دونوں سر پڑتے ہیں۔ لیکن یہی روزہ عید کے دن حرام ہے۔ اگر روزہ رکھ لے گا تو گناہ گار ہو جائے گا جس سے واضح ہے کہ نہ روزہ رکھنا عبادت ہے نہ چھوڑنا عبادت ہے کہنا ماننا عبادت ہے کہ جب ہم کہیں روزہ رکھو۔ جب ترک کرائیں ترک کر دو۔ اپنی تجویز کو دخل مت دو کہ یہی اطاعت درحقیقت عبادت ہے۔ یہ نماز روزہ عبادت کی صورتیں اور مثالیں ہیں۔ حقیقت عبادت اطاعت اور تسلیم و رضا ہے۔

خودکشی حرام اور بہت بڑا جرم اور گناہ ہے۔ مگر جہاد میں اپنے کو قتل کے لیے پیش کر دینا اور سر ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہی سب سے بڑی عبادت ہے، اس سے واضح ہے کہ نہ جان دینا عبادت ہے نہ جان بچانا عبادت ہے۔ کہنا ماننا اور بروقت تعمیل حکم کرنا عبادت ہے۔ یہی قتل اپنے نفس کے لیے کیا جائے تو معصیت کہ خلاف اطاعت ہے اور یہی قتل نفس اگر حفاظتِ دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی خاطر کیا جائے تو شہادت اور عین دین و عبادت ہے کیونکہ یہ نفس اور بدن آپ کی ملکیت نہیں بلکہ سرکاری مشین ہے اس کو آپ اپنی مرضی سے ضائع نہیں کر سکتے ہاں مالک کے حکم پر رکھ بھی سکتے ہیں اور کھو بھی سکتے ہیں۔ وہ رکھوائے تو اس کا رکھنا اور بچانا عبادت ہے۔ وہ خود ہی اسے تلف کرالیں تو تلف کر دینا ہی عبادت ہے۔ لوٹ مار اور غارتگری معصیت ہے نہ اس سے بچنا عبادت ہے اور نہ کرنا معصیت ہے۔ اگر کہے کے مطابق لوٹ مار بھی ہو تو عبادت ہے اور کہے کے خلاف امن و امان دینا بھی معصیت ہے۔

زمین پر اکڑ کر سینہ تان کر اور مونڈھے ہلا کر چلنا تکبّر ہے جس کو قرآن نے حرام فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ :-

لاتمش فی الارض مرحاً انک	خدا کی زمین پر تکبّر کی چال مت چلو کیونکہ
لن تخرق فی الارض ولن	تم اکڑ کر اور ابھر ابھر کر زمین کو چیر
تبلغ الجبال طولا ۔	نہیں دوگے ۔

اُونچے ہو کر طول میں آسمان تک نہیں پہنچ جاؤ گے۔ پھر کیوں یہ اینٹھ کر چلنے کی معصیت بھر رہے ہو، جس سے صاف واضح ہے کہ اینٹھ مروڑ کے ساتھ چلنا معصیت اور جُرم ہے۔ لیکن حج کے موقع پر جس طواف کے بعد سعی صفا مروا ہو اس میں ابتدا کے تین پھیروں میں اکڑ کر اور مونڈھے ہلا ہلا کر چلنا واجب اور جزوِ عبادت ہے ۔ اس سے معلوم ہُوا کہ نہ اکڑ کر چلنا معصیت ہے نہ جھک کر چلنا عبادت ہے بلکہ کہنا ماننا عبادت ہے۔ پس اصل چیز اطاعت حق نکلی ۔ اگر اطاعت کے خلاف ہے تو نماز روزہ بھی معصیت بن جاتے ہیں اور اگر کہے کے مطابق ہے تو جھوٹ ، لوٹ مار ، تکبّر کی چال اور غارتگری بھی عبادت بن جاتی ہے۔ پس اس طرح تمام خلقی قوتوں کو شریعت کے مطابق استعمال کیا جائے تو وہ سبب اطاعت بنتے جائیں گے اور خلافِ حکم استعمال کیا جائے تو معصیت ہوتی چلی جائیں گی ۔ اس سے عبادت کی دو قسمیں نکلتی ہیں ۔ ایک افعال خیر جن کا کیا جانا ضروری ہے اور ایک افعال شر جن سے بچایا جانا ضروری ہے ۔

بِر و تقویٰ پہلی قسم کو شریعت کی اصطلاح میں بِر کہتے ہیں جیسے فرمایا گیا :-

لیس البرّان تولوا وجوھکم قبل المشرق و المغرب ولٰکنّ البرّ من اٰمن باللّٰہ ۔ (الآیۃ)	کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آگیا) کہ تم اپنا منہ شرق کو کر لو یا مغرب کو لیکن اصلی کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالےٰ پر یقین رکھے ۔

اور دوسری نوع کو تقویٰ کہتے ہیں جس کے ذریعے گناہ سے بچا جاتا ہے عبادت کی ان دونوں نوعوں کو پیشِ نظر رکھ کر غور کرو تو انسان ملائکہ سے علم ہی میں بڑھا ہوا نہیں ہے بلکہ عبادت میں بھی فائق ہے۔ کیونکہ تقویٰ کی عبادت ملائکہ میں ہے ہی نہیں۔ کیونکہ تقویٰ کہتے ہیں شر سے بچنے کو اور بچنا اس چیز سے ہوتا ہے جس کا کرنا ممکن ہو۔ ظاہر ہے کہ ملائکہ میں شر کا مادہ ہی نہیں وہ شر کے افعال کر ہی نہیں سکتے تو ان سے بچنے کے لیے کہا بھی نہیں جا سکتا اور انسان شر کر بھی سکتا ہے اور اس سے بچ بھی سکتا ہے۔ اس لیے شر سے اُسے ہی روکا بھی جا سکتا ہے اور اس کا رُکنا عبادت بھی قرار پا سکتا ہے اور فرشتہ میں نہ شر کا مادہ ہے نہ اس کے شر سے بالارادہ رکنے کا ہی سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لیے تقویٰ کی نوع کی عبادت ہی فرشتہ کے لیے نہیں بلکہ یہ صرف انسان کے ساتھ مخصوص ہے تو انسان اس نوعِ عبادت میں ملائکہ سے بڑھ گیا۔ اب جو عبادتیں کرنے کی ہیں ان میں معاشرت، معاملات اور خانگی زندگی کی عبادت بھی فرشتوں کے لیے نہیں کیونکہ اُن میں نسل کا قصّہ ہی نہیں کہ ان کے عزیز و اقرباء پیدا ہوں اور معاملات لین دین آشتی و صُلح اور صلہ رحمی وغیرہ کی نوبت آئے۔ اس لیے بر کی دو تہائی حصّہ بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص نکلے۔ اب رہے اعتقادات سو یہ عبادت بھی انسان ہی کے ساتھ

مخصوص ہے۔ کیونکہ اعتقاد کی اصل ایمان ہے اور ایمان کے معنی ایمان بالغیب کے
ہیں اور فرشتہ کے حق میں وہ چیزیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے غیب ہی نہیں کہ
اسے ایمان کا مکلّف قرار دیا جائے اور ایمان لانے کی دعوت دیجائے۔ اس لیے
اعتقادات کا حصّہ بھی انسان ہی کے ساتھ مخصوص رہا۔ اب اگر رہ جاتا ہے تو
دیانات کا باب رہ جاتا ہے یعنی نماز روزہ زکواۃ وغیرہ۔ سو ان کی ضرورت
معاشرت کے لیے ہے۔ فرشتوں میں معاشرت ہی نہیں کیونکہ نسل نہیں اس لیے
مال کے لین دین کا بھی سوال نہیں ہو سکتا تو یہ عبادت بھی انسان ہی کے ساتھ
مخصوص رہی۔ رہا روزہ کے معنی اپنے ارادہ و نیت سے کھانا پینا اور لذّت نساء
کو ترک کرنا ہے۔ فرشتہ کے لیے نہ بیوی ہے نہ کھانا پینا تو وہاں اس عبادت
کے کوئی معنی ہی نہیں۔ اس لیے لے دے کر نماز رہ جاتی ہے۔ تو میں عرض کر
چکا ہوں کہ یہ فرشتہ کی طبعی بات ہے اور طبعی تقاضوں سے کسی کام کا کرنا عجیب نہیں۔
اس لیے انسان کا ایک سجدہ جو خلاف طبع کو برداشت کر کے ہوتا ہے فرشتہ
کی ہزار سالہ عبادت سے زیادہ وزنی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دیانات و
عبادات میں بھی انسان ہی فرشتہ سے افضل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان میں یہ
بہیمیت اور شیطنت والی قوتیں ہی ہیں جن کی بدولت تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔
فرشتہ میں یہ دونوں قوتیں نہیں۔ اس لیے وہ دو تہائی دین سے الگ تھلگ
ہے۔ اب انسان میں قوت عقلی ہے جو فرشتہ میں بھی ہے مگر اس عقل کے کتنے
ہی مصرف جس سے عقلی قوت کی تفصیلات کھلتی ہیں صرف انسان میں ہیں ملائکہ میں
نہیں۔ اس لیے وہ طاعت اور عبادت میں بھی وہ انواع پیش نہیں کر سکتا جو انسان

پیش کر سکتا ہے۔ غرض عبادت کے سینکڑوں دروازے ہیں جو فرشتوں پر بند ہیں اور انسان پر کھلے ہوئے ہیں۔ اسلام کے معنی زندگی کے تمام شعبوں کو قانونِ الٰہی کے ماتحت گزارنا ہے سو جو جامع زندگی انسان کو ملی ہے وہ کسی کو بھی نہیں ملی۔ اس لیے تمام اور تسلیم و رضا اس کی زندگی میں ممکن ہو سکتا ہے کسی دوسری نوع کے لیے ممکن نہیں۔ ابراہیم کو جب حکم ہوا :-

اذ قال لہ ربہ اسلم ۔ اے ابراہیمؑ مسلم بن جاؤ ۔

تو یہ مطلب نہ تھا کہ معاذ اللہ کفر سے اسلام میں داخل ہو بلکہ یہ تھا کہ اپنے آپ کو اللہ تعالےٰ کے حوالے کر دو اور گردن جھکا دو تو عرض کیا کہ :-

اسلمت لرب العالمین ۔ میں مسلم بن گیا ۔

ارشاد ہوا کہ اعلان کر دو کہ :-

انّ صلاتی و نسکی و محیای	میری نماز اور عبادت اور میری زندگی اور
و مماتی للہ رب العالمین	موت سب اللہ ہی کے لیے ہیں۔ کوئی اس کا
لاشریک لہ و بذالک امرت	شریک نہیں مجھے اسی کا حکم کیا گیا ہے اور میں
و انا اول المسلمین ۔	اوّل مسلمین میں سے ہوں ۔

پس اسی سپردگی و تسلیم کو اسلام کہتے ہیں کہ رضائے حق کے لیے جئے اور رضائے حق ہی کے لیے مرے۔ اسی کی خوشنودی کے لیے صلح کرے اسی کے لیے لڑے۔ اسی کے لیے محبت کرے۔ اسی کے لیے عداوت باندھے۔ اسی کے لیے دے اور اسی کے لیے ہاتھ روکے جیسا کہ ارشادِ نبویؐ ہے :-

من احب فی اللہ و ابغض فی اللہ و اعطی للہ و منع للہ فقد استکمل الایمان ۔

جو اللہ ہی کے لیے محبت کرے اسی کے لیے عداوت کرے اسی کیلئے دے اور اسی کیلئے ہاتھ روک لے تو اس نے ایمان کامل کر لیا۔

اور ظاہر ہے کہ یہ افعال فرشتہ کر ہی نہیں سکتا کہ اس میں نہ شہوت ہے نہ شیطنت نہ غفلت ہے نہ نخوت، اس لیے جو اطاعت انسان کر سکتا ہے وہ فرشتہ کر ہی نہیں سکتا کہ اس میں وہ مادے ہی نہیں جن کی روک مقام سے عبادت کی بے شمار شکلیں بنتی ہیں۔ اس لیے فرشتہ کو ان علوم کی وہ ضرورت بھی نہ تھی جو انسان کو تھی۔ کیونکہ جتنی مادی رکاوٹیں انسان کے پیچھے ہیں اتنے ہی دفاع و مدافعت کے طریقوں کا علم اس کے لیے ضروری تھا۔

انسان کا علم فرشتوں سے کامل ہے

اس سے واضح ہوا کہ انسان کا علم بھی فرشتوں کی نسبت کامل اور جامع ہے اور اس کی عبادت بھی ان کی نسبت کامل اور جامع ہے اور بوجہ مدافعت جتنی عبادت انسان کی مضبوط ہے فرشتہ کی نہیں ہو سکتی اور ظاہر ہے کہ جب علم بھی اس کا کامل اور عبادت بھی اسکی مکمل تو ساری کائنات میں سے صرف یہ انسان ہی مستحق تھا کہ نائب خداوندی بنے۔ کیونکہ کمالات خداوندی لامحدود ہونیکے باوجود وہی نوعوں میں اصولاً منحصر ہیں۔ کمالات علم اور کمالات عمل اور انہی دو میں یہ انسان ساری مخلوقات حتیٰ کہ فرشتوں سے بھی بڑھکر نکلا تو خدا کا نائب بھی ان کمالات میں ہی ہو سکتا تھا اور عمل چونکہ علم کے تابع ہے اس لیے اصل بنیاد خلافت علم ہی ٹھہرتا ہے جو انسان ہی میں حد کمال تک پہنچا ہوا ہے اس لیے اسی کو خلیفۂ الٰہی بنایا گیا۔

خلافت انسانی کے بارے میں ملائکہ کا سوال

اسی لیے جب فرشتوں نے عرض کیا کہ اگر زمین میں خلیفہ بنانا ہے تو ہمیں کیوں نہ خلیفہ بنا دیا جائے کہ ہم سے زیادہ آپ کی تقدیس و تسبیح کرنیوالا اور کون ہے؟ تو حق تعالےٰ نے اولاً حاکمانہ جواب دیا کہ اس معاملہ کو ہم جانتے ہیں تم نہیں جانتے جس سے ملائکہ خاموش ہو گئے اور پھر حکیمانہ جواب دیا کہ آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم دے کر ملائکہ کو چیلنج کیا کہ ذرا تم اشیاء کائنات کے نام تو بتاؤ وہ نہ بتا سکے تو آدمؑ سے فرمایا کہ تم بتاؤ۔ انہوں نے تمام نام گنا دیئے۔ تو بتلا دیا گیا کہ علم کا ابتدائی مرحلہ علم اسماء ہے جب اسی میں تم انسان سے بازی نہ لیجا سکے تو اسماء کے بعد صفات اشیاء پھر خواص اشیاء پھر حقائق اشیاء وغیرہ کے علوم میں تم ان سے کب بازی لے جا سکو گے اسلیئے مستحق خلافت انسان ہی ہے۔ رہا عملی میدان تو اسمیں ملائکہ نے نوع انسانی کی مذمت کی تھی کہ وہ خونریز ہو گا۔ مفسد ہو گا تو قدم قدم پر حق تعالےٰ اپنے نیک بندوں کے اعمال اوّل تو ملائکہ ہی سے لکھواتے ہیں۔

بارگاہ الٰہی سے قولی و عملی جواب

تاکہ قیامت تک انکے اس شبہ کا عملی جواب ہوتا رہے اور وہ انسان کی نیکی پر گواہ بنتے رہیں اور ساتھ ہی حدیث میں آیا ہے کہ جب کہیں مجلس وعظ و نصیحت وغیرہ منعقد ہوتی ہے تو ہزاروں فرشتے اس مجلس پر نازل ہوتے ہیں جو اسی لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ جب یہ مجلس خیر ختم ہوتی ہے تو وہ فرشتے آسمانوں میں چڑھتے ہیں اور انہیں حق تعالےٰ سے قرب ہوتا ہے۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں تم کہاں گئے تھے؟ عرض کرتے ہیں کہ آپکے بندوں کی مجلس میں۔ فرماتے ہیں تم نے میرے بندوں کو

کس حال میں دیکھا؟ عرض کرتے ہیں کہ آپ کی یاد میں مصروف تھے۔ آپکی جنت کے طالب تھے اور جہنم سے خائف تھے۔ فرماتے ہیں کہ کیا انہوں نے جنت و دوزخ کو دیکھا ہے؟ عرض کرتے ہیں دیکھا تو نہیں انبیاء سے سُن کر ایمان لائے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اگر جنت و نار کو دیکھ لیں تو کیا کریں؟ عرض کرتے ہیں کہ اگر دیکھ پائیں تو سوائے جنت مانگنے اور دوزخ سے پناہ مانگنے کے اُنہیں کوئی کام ہی نہ رہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تم گواہ ہو جاؤ کہ میں نے ان سب کو بخشدیا جو اس مجلس میں حاضر تھے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب بخشنا تھا تو ان اربوں کھربوں فرشتوں کے نازل فرمانے اور انہیں آسمان پر چڑھا کر ان سے پوچھنے اور اُنہیں گواہ بنا کر مغفرت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے بغیر بھی مغفرت فرما سکتے تھے؟ پھر یہ کہ ایسی مجلسیں دنیا میں نہ معلوم کتنی ہوتی ہیں اور ہر جگہ ملائکہ کا ان مجلسوں پر اُترنا اور پھر چڑھنا اور پھر گواہ بننا آخر کیا ضروری تھا؟ تو حقیقت یہ ہے کہ یہ ملائکہ کو عملی جواب دینے کے لیے ہے کہ جس بارے میں تم کہتے تھے کہ:۔

اتجعل فیھا من یفسد فیھا و یسفك الدماء۔	کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اور خونریزیاں کریں گے۔

تم نے دیکھا کہ وہ کس طرح عمل صالح اور بر و تقویٰ میں لگا ہُوا ہے اور کس درجہ صالح بن کر دین کو پھیلانے اور اس پر جمے رہنے کی سعی کر رہا ہے۔

انسانی اعمال پر فرشتوں کی گواہی کی حکمت

کیا یہ فساد ہے؟ کیا یہ خونریزی ہے؟ پس ایک طرف تو علم کے میدان میں انسان کو فرشتوں سے فائق ثابت کرایا اور ایک طرف عبادت و طاعت میں

اسے فرشتوں سے اُونچا ثابت فرمایا اور خود فرشتوں ہی کو اسکی نیکی پر گواہ بنایا تاکہ اسکی سفاکی اور فساد کا تخیّل ان کے ذہن سے نکل جائے اور وہ بصدق دل اس کی خلافت کے معترف ہو جائیں۔ چنانچہ ہر غیر معمولی عمل و عبادت کے مواقع پر ملائکہ کو اسی طرح گواہ بنایا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب حاجی احرام باندھ کر حج و زیارت کرتے اور طواف و سعی میں دوڑتے ہیں۔ منیٰ و عرفات میں ٹھہرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ملائکہ کو خطاب فرماتے ہیں کہ یہ لوگ آخر گھر بار چھوڑ کر، بیوی بچوں سے مُنہ موڑ کر سر سے کفن باندھکر اپنی لذّت و آرام کو مٹا کر یہاں کیوں آئے ہیں؟ یہ صرف میری خوشنودی اور رضا کے لیے آئے ہیں اور پروانوں کی طرح نثار ہو رہے ہیں۔ اے ملائکہ تم گواہ رہو کہ میں نے اُن کو بخش دیا۔ حقیقت میں یہ فرشتوں کا وہی عملی جواب ہے کہ وہ انسان جس کے متعلق تم نے اتجعل فیہا من یفسد فیہا کہا تھا۔ دیکھو کیا طاعت و عبادت اور ترک لذات میں اپنے رب کیخاطر مصروف ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ دن کے اعمال لکھنے والے ملائکہ الگ ہیں اور رات کے الگ۔ دن والے فرشتے عصر کی نماز کیوقت اُوپر چڑھتے ہیں اور اعمالنامے رات والے ملائکہ کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ اور رات والے فرشتے صبح کی نماز کیوقت دن والوں کو چارج دیکر اوپر چڑھتے ہیں غرض دونوں وقتوں کے ملائکہ کا عروج و نزول فجر اور عصر کی نمازوں کے وقت کر لیا گیا۔ ان کے چڑھنے پر حق تعالیٰ جب دریافت فرماتے ہیں کہ ہمارے بندوں کو تم نے کس حال میں چھوڑا؟ تو جواب میں عرض کرتے ہیں کہ

ترکناھم وھم یصلّون واتیناھم	جب ہم نے انہیں چھوڑا جب بھی نماز میں مصروف تھے اور
وھم یصلّون ۔	جب ہم نے جاکر دیکھا جب بھی نماز ہی میں مشغول تھے۔

سو یہ وہی عملی جواب ہے کہ جن کے بارے میں تم مفسد اور سفاک ہونے کے مدعی تھے۔ دیکھو وہ رات دن کیسا مصروف عبادت ہے۔ یہ معاملہ روزانہ صبح اور شام ہوتا رہتا ہے۔ گویا صبح شام ملائکہ کو عملی جواب دے کر انسان کی برتری اُن پہ جتائی جاتی ہے تاکہ روزانہ ان کو عملی جواب ملتا رہے اور وہ انسان کی فضیلت اور اسکی خلافت کے معترف ہوتے رہیں۔ پھر نہ صرف علم و عمل ہی انسان کا فرشتوں سے بالا و برتر ہے بلکہ احوال و کیفیات بھی دیکھی جائیں جو قرب الٰہی سے اسے حاصل ہوتی ہیں سو وہ بھی احوال ملائکہ سے بالا و برتر ہیں۔ آخر جو احوال کیفیات انبیاءؑ اور اولیاء اللہ پہ طاری ہوتی ہیں وہ فرشتوں پر نہیں آسکتیں کیونکہ نہ ملائکہ علم و عمل کے ان میدانوں سے گزرتے ہیں جس سے انسان گزرتا ہے۔ نہ ان پہ وہ کیفیات عشق و محبت طاری ہوتی ہیں جو انسان پر ہوتی ہیں اور جب علم عمل، حال سب ہی میں انسان ملائکہ سے فائق ہے تو انسان ہی کا حق تھا کہ اسے نیابت کی نعمت سے نوازا جائے اور اپنا نائب بنایا جائے کہ بناء خلافت یہی دو چیزیں تھیں یعنی علم خداوندی اور اخلاق خداوندی وہ دونوں جب اس میں علی وجہ الاتم ثابت ہوتے ہیں تو خلافت بھی علی وجہ الاتم اسمیں آسکتی تھی۔

تکمیل خلافت کا مقام البتہ یہ ضرور ہے کہ تکمیل خلافت دنیا میں نہیں ہوتی بلکہ آخرت میں ہوگی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ بنائے خلافت جبکہ علم کامل اور عمل کامل ہے تو یہ علم و عمل جب تک کہ اسی انداز کا نہ ہوگا جس انداز کا خود حق تعالےٰ کا ہے اس وقت تک اس انسان کی علمی و عملی خلافت کی تکمیل نہیں ہوسکتی اور ظاہر ہے کہ حق تعالےٰ کے علم اور عمل کی شان یہ ہے کہ وہ

اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ اس کا علم بھی اسباب سے بے نیاز ہے۔ یہ نہیں کہ حق تعالیٰ نے کوئی کتاب پڑھ کر یہ علم حاصل کر لیا۔ معاذ اللہ۔ بلکہ علم کا سرچشمہ خود اسکی ذات ہے یعنی علم خود اس کی ذات بابرکات سے اُبھرتا ہے۔ ایسے ہی اس کی صناعی بھی وسائل و آلات کی محتاج نہیں۔ بلکہ جب کسی چیز کے بنانے کا ارادہ کرتے ہیں تو فرما دیتے ہیں کن (ہوجا) فیکون تو وہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ پل بھر میں جہان بنا دیتے ہیں اور ان کے ارادہ ہی سے وہ چیز خود بخود معرض وجود میں آجاتی ہے۔

انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول له کن فیکون۔ بلاشبہ اس کا معاملہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کیا تو کہدیتا ہے کہ ہوجا پس وہ ہو جاتی ہے۔

اس صورتحال کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو یہ کیفیت اس میں جنت میں داخل ہو کر پیدا ہو گی۔ چنانچہ علم تو یہ ہو گا یعنی ماضی و مستقبل سب کچھ انسان پہ روشن ہو کر اس کے علم میں آجائے گا۔ اگلے پچھلے تمام کئے ہوئے اعمال اسکے سامنے آجائیں گے اور یہ علوم اسے خود بخود حاصل ہوں گے نہ کوئی استاد ہو گا نہ کتاب بلکہ نفس انسانی خود مُدرک بن جائے گا۔ فرمایا گیا:۔

علمت نفس ما احضرت تو اس وقت ہر شخص ان اعمال کو جان لیگا جو لے کر آیا ہے۔

ادھر عمل کی یہ کیفیت ہو گی کہ تمام صنعتیں اس کی قوت متخیلہ کی تابع ہو جائینگی کسب و محنت اور اختیار اسباب کی ضرورت نہ ہو گی جس چیز کی خواہش ہو گی ارادہ کرتے ہی وہ چیز سامنے آجائیگی اسی کو قرآن کریم میں فرمایا گیا:۔

ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون۔ — اور تمہارے لیے اس جنت میں جس چیز کو تمہارا جی چاہے گا موجود ہے اور نیز تمہارے لیے اس میں جو مانگوگے موجود ہے۔

گویا کن فیکون کی طاقت پیدا ہو جائے گی کہ جو چاہا وہی ہو گیا۔ نہ اسباب کی ضرورت نہ وسائل کی اور جب علم انسانی اسباب سے مستغنی ہو جائے گا اور عمل، کسب و ریاضت سے مستغنی ہو کر محض قوت ارادہ کے تابع ہو جائیگا۔ بالفاظِ دیگر حق تعالےٰ کے علم و صفت کے مشابہ ہو جائیگا۔ تو اس وقت انسان کی علمی و عملی خلافت مکمل ہو گی کہ وہ جس کا نائب ہے وہ علم و عمل میں کامل ہے اور اس نائب الٰہی کا علم و عمل اس کے علم و عمل کے مشابہ ہو جائیگا اور جبکہ بنائے خلافت بھی علم و عمل ہی تھا جو اب علم و عمل خداوندی کے مشابہ بن گیا تو خلافت بھی صحیح معنی میں اسی وقت مستحکم و مضبوط ہو گی۔ مگر جنت میں یہ استحکام خلافت جب ہی ہو گا جب دُنیا میں علم و عمل کے اسباب و وسائل اختیار کر کے اسے جزو نفس بنا لینے کی انسان نے سعی کی ہو گی ورنہ یہاں کی محرومی سے وہاں بھی محرومی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ کامل بن جانیکے بعد حق تعالےٰ ان بندوں کو انہی القاب و خطابات سے یاد فرمائیں گے جو القاب و خطاب خود انکے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالےٰ جنتیوں کو نشاط میں لانے کے لیے ان کے نام خطوط بھیجیں گے۔ فرشتے خطوط رسانی کا کام کریں گے ان خطوط کے لفافوں پر پتہ یہ لکھا ہو گا:۔

من العزیز الرحیم الی العزیز الرحیم — عزیز رحیم کی طرف سے یہ خط عزیز رحیم کو پہنچے۔

یعنی القاب بھی وہی دیدیں گے۔ جو خود اُن کے سرکاری خطابات ہیں۔ بس اسی عالم میں انسان صورۃً خلیفہ خداوندی ہے اور محض خلافت کے راستہ پر پڑتا ہے۔ آخرت میں پہنچکر حقیقی معنی میں خلیفۂ خداوندی بن جائے گا۔ مگر یہ منزل جب ہی آئیگی جب اس کا راستہ دُنیا میں اختیار کر لیا جائیگا۔ اگر یہاں نیابت کی یہ ظاہری صُورت اختیار نہ کی جائے جو طاعت و عبادت سے بنتی ہے تو وہاں تکمیل کس چیز کی ہو جائے گی اور کیسے ہو جائے گی۔ بہرحال یہ واضح ہوگیا کہ جنّات ملائکہ اور حیوانات میں سے اس خلافت کے عہدہ کے لیے کسی کا انتخاب عمل میں نہ آیا، آیا تو صرف اِنسان کا آیا۔

ع قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

سو ان میں سے حیوانات تو قابلِ خطاب ہی نہ تھے۔ اس لیے قابلِ ذکر بھی نہ تھے۔ قابلِ ذکر ملائکہ جنّات اور انسان ہی تھے۔ سو انہی کا اللہ نے اس آیت میں ذکر فرما کر ہر ایک کی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ملائکہ کا ذکر فرما کر ان کی علمی کم مائیگی پر روشنی ڈالی گئی کہ وہ علم کے میدانِ مقابلہ میں انسان سے ہار گئے۔ شیطان کا ذکر فرما کر جو جنّات میں سے ہے اس کے فہم و عمل کی کوتاہی پر روشنی ڈالی کہ وہ امرِ خداوندی کے معارضہ پر اُتر آیا اور سرکشی پر آمادہ ہوگیا جو اُس کی بدفہمی اور بدنیتی تھی۔ پس نہ کم علم خلیفۂ الٰہی بن سکتا تھا نہ بدفہم اور بدنیّت۔ انسان نے علم کا بھی ثبوت دیا کہ اشیاء کے نام سیکھ لیے اور تعمیل ارشاد کا بھی ثبوت دیا کہ جنّت کی سکونت کا حکم دیا گیا تو وہاں جا داخل ہوا اور علم اسماء سے اسکا علم ترقی کر گیا جس سے زندگی اس کی جامع ہوئی اور ان ناموں کے ذریعے

اس نے تمام اشیاء زندگی پر قابو پالیا۔ اور کائنات اس کے لیے مسخر ہو گئی۔ ملائکہ اس کی خدمت پر لگا دیئے گئے اور شیطان کو مردود بنا کر اسکے مقابلہ پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ چوکنا رہے اور اس کا مقابلہ کرکے اپنی مخفی علمی اور عملی قوتوں کا ثبوت دے اور اسی طرح اس کی خلافت روز افزوں چمکتی رہے۔ یہ علم انبیاء کو دیا اور انبیاء نے یہ علم جو مبنائے خلافت ہے بنی نوع انسان کو سکھایا۔ پس انبیاء علیہم السلام حق تعالیٰ کے تو شاگرد ہیں اور کائنات کے استاذ اور مربی ہیں۔ حق تعالیٰ نے ان پاکباز استادوں کا گروہ کم و بیش ایک لاکھ ۲۴ ہزار کی تعداد میں بھیجا اور دُنیا کو حکم دیا کہ اُن سے علم سیکھے اور اُن کے سامنے زانوئے ادب تہ کرے۔ پس یوں سمجھو کہ یہ پوری دُنیا ایک مدرسہ ہے جس کا فرش زمین ہے چھت آسمان ہے اسمیں چاند، سورج اور ستاروں سے چاندنا کیا۔ انسان و جنات اس مدرسہ کے طلبہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام استاد ہیں اور ملائکہ خدام مدرسہ ہیں، نگران اور منتظم ہیں۔ طلبہ کے لیے وظیفہ کی ضرورت تھی تو اس زمین کو دسترخوان بنایا تاکہ طلباء وظیفہ پاسکیں اور انکی ضروریات پوری ہوں اور وہ ہمہ تن علم کی تکمیل میں لگ کر استحقاقِ خلافت کو مکمل کریں اور اس طرح انسان کی فوقیت باقی تینوں ذی شعور انواع پر واضح ہو گئی جس کی بناء علم ہے۔

مجددین و علمائے ربانی انبیاء کے نائب ہیں

یہ علمی اور عملی خلافت قیامت تک باقی رہے گی۔ انبیاء علیہم السلام اوّلین خلفائے ربانی ہیں ان کے بعد ان کے وارث خلیفہ ہوتے ہیں جو علمائے ربانی ہیں اور انکا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ حدیث شریف میں ہے :-

یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغافلین و انتحال المبطلین و تاویل الجاھلین ۔

اس علم دین کو تمام پچھلے لوگوں میں سے عادل افراد اختیار کریں گے اور اس سے غلو کرنیوالوں کی تحریفات اور باطل پسندوں کی کج روی اور جہلاء کی تاویلات کا دفاع کرتے رہیں گے ۔

پھر ہر صدی پر مجدّدین کا وعدہ دیا گیا ہے جو علماء راسخین فی العلم ہوں گے یہ حضرات علماء اس علم الہٰی کو غلو کرنے والوں کی تحریفوں، باطل پسندوں کی دروغبافیوں اور جاہلوں کی رکیک تاویلوں کا پردہ چاک کرتے رہیں گے اور جو شکوک و شبہات اہل باطل اور اہل زیغ اس علم میں ڈالیں گے۔ یہ اہل علم دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرتے رہیں گے۔ پس یہ امت لاوارثی امت نہیں کہ جس کا جی چاہے اس کے علم و دین کا حلیہ بگاڑ دے اور کسی بھی مفسد و عیّار کی دین میں پیش نہ چلے گی۔ حدیث میں آپ نے فرمایا :۔

کیف تھلک امۃ انا اولھا والمھدی وسطھا والمسیح اٰخرھا ۔

کیسے ہلاک ہو سکتی ہے وہ قوم کہ جسکا اوّل میں ہوں درمیان میں مہدی اور مسیح آخیر ہیں ۔

دین کی حفاظت کا سامان

آپؐ نے فرمایا :

لا تجتمع امتی علی الضلالۃ

میری اُمت گمراہی پر جمع نہیں ہوتی ۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ :۔

لا تزال طائفۃ من امتی منصورین علی الحق لا یضرھم من خاذلھم ولا من خالفھم حتی یأتی امر اللہ

میری امت کی ایک جماعت کی ہمیشہ دین پر مدد کیجاتی رہیگی۔ انکو ذلیل کرنیوالا انکی مخالفت کرنیوالا انکو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیگا یہاں تک کہ اللہ ہی کا حکم آجائے ۔

پس جس اُمت کو اس قدر کے اخلاف رشید کے وعدے دیئے گئے ہوں وہ اُمت لاوارثی اُمت نہیں ہوسکتی۔ اس کی پُشت پناہی اللہ و رسول کی طرف سے برابر جاری رہے گی جیسا کہ رہتی آرہی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:۔

مثل امتی کمثل المطر	میری اُمت کی مثال بارش جیسی ہے
لا یدری اولھا خیر ام	یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ اس کا اوّل زیادہ
آخرھا ؟	بہتر ہے یا اس کا اخیر۔

پس انبیاء علیہم السلام کا ترکہ اس وارث امتی کو ملتا رہے گا جو اپنا روحانی نسب حضورؐ سے جوڑے رکھے گا اور وہ ترکہ بھی علم ہے کیونکہ انبیاء مال و دولت وراثت میں نہیں چھوڑتے بلکہ علم و معرفت چھوڑتے ہیں۔ اسی علم و معرفت سے آدمی آدمی بنتا ہے اور انسانیت اسی علم پر موقوف ہے اگر دُنیا میں انبیاء علیہم السلام تشریف نہ لاتے تو انسان ڈھوروں، ڈنگروں کا ایک گلہ ہوتا جو بقولِ ملائکہ اس دُنیا میں آنے کے بعد بجز سفا کی اور مفسدہ پردازی کے کوئی دُوسرا کام نہ جانتا۔ پس مادی تعلیم اور سائنس وغیرہ عمدہ عمدہ سامان تو پیدا کرسکتی ہے مگر عمدہ انسان پیدا نہیں کرسکتی۔

مادہ و سائنس کی بے مائیگی

عمدہ انسان صرف انبیاءؑ کی لائی ہوئی تعلیم ہی سے پیدا ہوسکتے ہیں۔ سائنس سے باہر تو چاندنا ہوتا ہے مگر اندر اندھیرا ہو جاتا ہے نہ تقویٰ ظاہر ہوتا ہے نہ تقوے باطن۔ ظاہراً مادیات کی ترقی ہو رہی ہے مگر اندر کے جوہر تباہ ہو رہے ہیں انسان نے نئی ایجادات میں اپنی تمام طاقتوں کو گم کر دیا اور اس کی محتاجگی بڑھ گئی۔ اگر وہ

اُڑنا چاہے تو لوہے لکڑی پیتل کا محتاج ہے۔ اگر بعید مسافت پر خبر دینا چاہے تو لاسلکی اور رائرلیس کا محتاج۔ اگر کسی دور دراز مقام پر پہنچنا چاہے تو ریل موٹر کا محتاج یعنی خود اپنی نفس کی اندرونی طاقت سے یہ کام نہیں کر سکتا۔ بلکہ ان آلات و وسائل کا دست نگر ہے۔ مرد وہ تھے جنہوں نے اپنے اندر وہ طاقت پیدا کی کہ ہزار ہا میل کی مسافت پر بلا لاسلکی کے آوازیں پہنچائیں۔ جیسے حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے بیت اللہ کے بن جانے کے بعد حج کرنے کی ہدایت کی آواز لگائی تو وہ سارے عالم میں گونجی۔ فاروق اعظمؓ نے مسجد نبویؐ سے ساریہؓ کو آواز دی تو وہ ڈھائی سو میل پر بلا ریڈیو کے پہنچی۔ انہوں نے بلند پروازی دکھلائی۔ وہ کسی ہوائی جہاز کے محتاج نہ ہوئے۔ حضرت مسیح علیہ السلام چوتھے آسمان پر پہنچے۔ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم ساتوں آسمانوں سے گزر کر مستویٰ تک پہنچے۔ مگر محض اپنی اندرونی روحانی قوت سے نہ کہ مادی وسائل سے۔ اس لیے اپنے اندر جوہر پیدا کرو۔ لوہے پیتل کے محتاج بن کر مت رہ جاؤ۔ اسباب کے بندے نہ بنو۔ مسبب الاسباب کے بندے بنو۔ آج کی یہ ترقی انتہائی محتاجگی کی ترقی ہے۔ حالانکہ انسانی ترقی استغنأ کی ترقی ہے۔ لوہے، پیتل اور دیگر معدنیات کا غلام بن جانا ترقی نہیں بلکہ ان چیزوں کو اپنی غلامی پر مجبور کر دینا ترقی ہے۔ آج کا انسان صرف اُس جگہ باکمال ہے جہاں مشینیں ہوں، بجلی ہو، پاور ہاؤس ہو، پٹرول ہو۔ جہاں یہ چیزیں نہ ہوں وہ عاجز بے بس اور بےکس ہے۔ انسان کامل وہ ہے کہ اگر زمین پر ہو تو بھی باکمال ہو اگر زمین کے اندر ہو تو بھی باکمال۔

علم الٰہی کی مثال شیخ شہاب الدین سہروردی نے ایک حکایت بیان کی ہے جس کو مولائے رومی نے نقل فرمایا ہے کہ ایک دفعہ رومیوں اور چینیوں کے درمیان جھگڑا ہُوا۔ رومیوں نے کہا ہم اچھے صنّاع اور کاریگر ہیں چینیوں نے کہا ہم ہیں۔ بادشاہ کے سامنے مقدّمہ پیش ہُوا۔ بادشاہ نے کہا کہ تم اپنی اپنی صنّاعی دکھلاؤ۔ اس وقت دونوں صنّاعیوں کا موازنہ کرکے فیصلہ کیا جائیگا اور اسکی صورت یہ کی گئی کہ بادشاہ نے ایک مکان بنوایا اور اسکے درمیان پردہ کی ایک دیوار کھڑی کر دی چینیوں سے کہا کہ نصف مکان میں تم اپنی کاریگری دکھلاؤ اور رومیوں سے کہا کہ دُوسرے نصف میں تم اپنی صنّاعی کا نمُونہ پیش کرو۔ چینیوں نے تو دیواروں پر پلاستر کرکے قسم قسم کے بیل بُوٹے اور پھُول پتّے رنگ برنگ کے بنائے اور اپنے حصّہ کے کمرہ کو مختلف نقش ونگار اور رنگا رنگ بیل بوٹوں سے گل وگلزار بنادیا ادھر رُومیوں نے دیواروں پر پلاستر کرکے ایک بھی پھول نہ بنایا اور نہ ہی کوئی ایک بھی رنگ لگایا۔ بلکہ دیوار کے پلاستر کو صقیل کرنا شروع کر دیا اور گھوٹتے گھوٹتے اتنا صاف اور چمکدار کر دیا کہ اسمیں آئینہ کی طرح صورت نظر آنے لگی جب دونوں نے اپنی اپنی کاریگری اور صنّاعی ختم کر لی تو بادشاہ کو اطلاع دی۔ بادشاہ آیا اور حکم دیا کہ درمیان سے دیوار نکال دی جائے۔ جونہی دیوار بیچ میں سے ہٹی۔ چینیوں کی وہ تمام نقاشی اور گلکاری رومیوں کی دیوار میں نظر آنے لگی اور وہ تمام بیل بُوٹے رومیوں کی دیوار میں منعکس ہوگئے جسے رومیوں نے صقیل کرکے آئینہ بنادیا تھا۔ بادشاہ سخت حیران ہُوا کہ کس کے حق میں فیصلہ دے کیونکہ ایک ہی قسم کے نقش ونگار دونوں طرف نظر آرہے تھے۔ آخر کار اس نے رومیوں کے حق میں فیصلہ دیا کہ ان کی صناعی اعلیٰ ہے۔

کیونکہ انہوں نے اپنی صناعی بھی دکھلائی اور ساتھ ہی چینیوں کی کارگیری بھی چھین لی۔

مولانا روم نے اس قصہ کو نقل کر کے آخر میں بطور نصیحت کے فرمایا کہ اے عزیز! تو اپنے دل پر رومیوں کی صناعی جاری کر یعنی اپنے قلب کو ریاضت و مجاہدہ سے مانجھ کر اتنا صاف کر لے کہ تجھے گھر بیٹھے ہی دُنیا کے سارے نقش و نگار اپنے دل میں نظر آنے لگیں:۔

ستم است اگر ہوست کشد بہ سیر سرو چمن درآ
تو ز غنچہ کم دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ

یعنی تو اپنے دل کی کھڑکیوں کو کھول دے اور اسمیں سے ہر قسم کا مادی مَیل کچیل نکال پھینک اور اسے علم الٰہی کی روشنی سے منوّر کر دے تو تجھے دُنیا و آخرت کے حقائق و معارف گھر بیٹھے ہی نظر آنے لگیں گے۔

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید او ستا

ایسے قلب صافی پر بے استاذ و کتاب براہِ راست علومِ خداوندی کا فیضان ہوتا ہے اور وہ روشن سے روشن تر ہوتا جاتا ہے مگر یہ شان مادی علوم کی نہیں۔ صرف روحانی اور شرعی علوم کی ہے جبکہ ان پر عمل کیا جائے۔ حدیث میں ہے۔ من عمل بما علم ورثه الله علم مالم يعلم۔ عمل کی برکت سے حق تعالیٰ قلب میں وہ علوم ڈالتا ہے جو پہلے سے اسمیں نہ تھے۔ اسلیے انسان اگر انسانیت چاہتا ہے تو اولاً عالم بنے پھر عامل بنے۔ تب آخر کار علم لدنی کا وارث بنتا ہے۔ پس ابتدائی علم علم دراست ہے اور انتہائی علم علمِ وراثت ہے۔ یہ کتابوں کے درس و مطالعہ کا علم علم درایت ہے۔

مدارس دینیہ انسانیت کی فیکٹریاں ہیں

اور اس کی عملی مشق سے پیدا شدہ بصیرت و گہرائی علمِ وراثت ہے۔

مگر علم وراثت نصیب ہوتا ہے علم دراست ہی سے۔ پس مدارس علم دراست سکھاتے ہیں اور علم وراثت کا راستہ صاف کرتے ہیں۔ اگر یہ مدارس دینیہ نہ ہوں تو نہ علم دراست ملے نہ علم وراثت۔ بس یہ مدارس اس لیے قائم کئے جارہے ہیں کہ جو علوم ہمیں انبیاء سے وراثت میں ملے ہیں ان کو انسانوں تک پہنچا کر انسانوں کو انسان بنایا جائے۔ اس لیے یہ مدارس گویا سچے انسانوں کو ڈھالنے کی فیکٹریاں ہیں۔ پس سائنس کی فیکٹریاں اور مشینریاں سامان ڈھالتی ہیں اور یہ مدارس کی فیکٹریاں انسان ڈھالتی ہیں جس کے ظاہر و باطن علوم انبیاء سے روشن ہوں۔ مادی علوم محض ظاہری ٹیپ ٹاپ اور نمائش سکھاتے ہیں اور یہ حقیقی علوم (علوم شرعیہ) باطن کی آراستگی سکھاتے ہیں۔ مادی علوم صورت کا جمال بخشتا ہے اور روحانی علم سیرت کا جمال عطا کرتا ہے اور محض صورت کا جمال ایک عارضی حسن و جمال ہے جو جاتا آتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن مٹ جائے گا۔ اسے نو دو دن بخار ہی آکر مٹا دیتا ہے۔ یہ تمام رعنائی اور زیبائی ختم ہو جاتی ہے اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو بڑھاپے سے یہ ظاہری جمال کے سارے نقش و نگار زائل ہو جاتے ہیں اور بڑھاپا بھی نہ آئے تو موت تو کہیں گئی ہی نہیں وہ تو ساری صورتیں اور خوبصورتیاں مٹا کر رہتی ہے۔ البتہ سیرت پر اس کا بس نہیں چلتا۔ سیرت دنیا میں جیسی بھی بنالی جائے اُسے موت نہیں مٹا سکتی وہ قبر میں، حشر میں اور اسکے بعد برابر قائم رہتی ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے۔

تحشرون کما تموتون و تموتون کما تحیون۔ — اٹھائے جاؤ گے تم جس حال میں تم مرو گے اور مرو گے تم جس حال میں تم زندہ رہو گے۔

حشر تمہارا اس حالت پر ہوگا جس حالت پر موت آئی اور موت اس حالت پر

آئے گی جس پر زندگی گزاری ہے۔ آج کل نوجوان صورت کے بنانے سنوارنے میں مصروف ہیں۔ حالانکہ اس چیز کے بنانے سے کیا فائدہ جو بنی ہے بگڑنے کے لیے یعنی محض صورت آرائی شہوت رانی ہے اور سیرت آرائی مردانگی ہے۔ پس آپ اس صورت کو کہاں تک بنائیں گے؟ جو بگڑنے ہی کے لیے بنی ہے اسکو کہاں تک بنائیں گے سنواریں گے۔ بنانا اس چیز کا ضروری ہے جو بن کر بگڑتی نہ ہو اور وہ سیرت اور اخلاقِ فاضلہ اور علوم و کمالات ہیں دُنیا میں صورت فتنہ کا ذریعہ بنتی ہے اور سیرت عز و جاہ کا۔ یوسف علیہ السّلام کنعان کے کنوئیں میں ڈالے گئے۔ مصر کے بازار میں کھوٹے داموں بیچے گئے، زلیخا کے غلام بنے۔ پھر جیلخانہ میں قید ہوئے۔ یہ سارے فتنے حسن صُورت نے پیدا کئے لیکن جب مصر کی سلطنت ملنے کا وقت آیا تو وہاں سیرت نے کام کیا۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السّلام نے مصر کی حکومت کا مطالبہ کرتے وقت یہ نہیں کہا تھا کہ اجعلنی علی خزائن الارض انی حسین جمیل۔ بلکہ انی حفیظ علیم کہا تھا یعنی علمی اور عملی سیرت پیش کی تھی جس سے حکومت ملی۔ صورت پیش نہیں کی تھی جس سے غلامی اور جیل کی قید و بند ملی تھی۔ پس حسنِ صورت فتنہ پیدا کرتا ہے اور حسنِ سیرت عز و جاہ پیدا کرتا ہے۔ انبیاء علیہ السّلام اسی سیرت کے سنوارنے کے لیے اس دُنیا میں تشریف لائے ہیں صورتوں کی آرائش کرانے کے لیے نہیں۔

ان اللہ لا ینظر الی صورکم واموالکم و لکن ینظر الی قلوبکم و اعمالکم۔	حق تعالےٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتے بلکہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمالوں کو دیکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا۔ اس کی نظر تمہارے دلوں اور اعمال پر ہے۔ وہاں یہ معیار نہیں کہ جو دولتمند اور خوبصورت ہو اُسے قبول فرمالے اور جو غریب بدصورت ہو اُسے رد کر دے۔ یہی معیار انبیاء علیہم السّلام کے ہاں بھی ہے کہ وہ آدمی کا ردّ و قبول حُسن و صُورت سے نہیں بلکہ حسن سیرت سے کرتے ہیں۔ دُنیا والوں کے ہاں ردّ و قبول کا معیار حسن صورت اور دولت ہے۔

حضرت بلال حبشیؓ صورتاً سیاہ تھے غلام حبشی تھے مگر حضرت عمرؓ ان کو ھو سیدنا و مولانا فرماتے اور صحابہؓ کی گردنیں بلال کے آگے جُھک جاتیں حسن صورت کی وجہ سے نہیں کہ وہ تھا ہی نہیں بلکہ حسن سیرت کی وجہ سے کہ وہ بحدِ کمال ان میں موجود تھی۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ فرماتے تھے۔

ما رأیت افضل من عطاء ابن ابی رباح

حالانکہ وہ صورت کے کالے تھے وہ صورت کی تعریف نہیں تھی۔ سیرت کی تھی۔ جس نے کالوں کو گوروں کے اُوپر حاکم بنایا اور سیرت دو ہی چیزوں سے بنتی ہے۔ قوت علم اور قوت اخلاق (یعنی قوت عمل) ان ہی دونوں قوتوں سے آدمی باقی مخلوق پر فائق ہوتا ہے اور اُسے خلافت ملتی ہے۔ قرب حق نصیب ہوتا ہے اور صُورت دو چیزوں سے بنتی ہے۔ دولت سے اور جہالت سے۔

مدارسِ دینیہ سیرت سنوارنے کیلئے ہیں

پس یہ مدارس دینیہ انسانیت کے ان ہی دو جوہروں کے پیدا کرنے کے لیے ہیں۔ اگر یہ مدارس نہ ہوں تو انسانیت دُنیا سے ختم ہو جائے گی۔ کالج اور یونیورسٹیوں میں لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں۔ مگر وہاں انسانیت

نہیں سکھائی جاتی۔ صرف صورتِ انسانی بنائی جاتی ہے۔ لیکن ان ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں جن کا نام مدرسہ اور خانقاہ ہے حقیقت انسانیت سکھائی جاتی ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم پر چلنے حتیٰ کہ فقر و فاقہ تک سے بھی انسانیت حاصل کر لینی سکھائی جاتی ہے۔ زہد و قناعت اسی علم کی بدولت قائم ہے۔ یہ علماء سو پچاس روپے کی تنخواہ پر بخوشی گذارہ کر لیتے ہیں۔ ورنہ آج کل سو روپے کیا وقعت رکھتے ہیں۔ یہ اسی سیرت کی خوبی کا کمال ہے کہ یہ لوگ اس تھوڑے پر راضی اور مطمئن ہیں۔ حضرت مولانا تھانویؒ اس شعر کو بار بار پڑھتے اور کیف لے لے کر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

ما ہیچ نداریم غمِ ہیچ نداریم دستار نداریم غمِ ہیچ نداریم

اور کبھی فرماتے ؎

لنگلے زیر و لنگلے بالا نے غمِ دزد و نے غمِ کالا

اور کبھی فرماتے ؎

کس نیاید بہ خانۂ درویش کہ خراجِ زمین و باغ بدہ

کل تک ہم زہد و قناعت کی فضیلت محض شرعی تعلیم پیش کر کے بتلاتے تھے لیکن آج زمانہ نے اس کی خوبیوں کا خود دنیا والوں کو مشاہدہ کرا دیا ہے۔ ہزاروں من غلے والے غیر مطمئن ہیں۔ لاکھوں کروڑوں روپے والے پریشان حال اور نالاں ہیں۔ لیکن جن کے پاس غلہ ہی نہیں یا بقدرِ ضرورت ہے وہ مطمئن ہیں۔ پس دنیا کی کثرت اور سرمایہ داری کی افراط حسن نہیں۔ ایمان اور تقویٰ حسن ہے۔ ورنہ دنیا کی کثرت کا تو یہ حال ہے کہ جب آتی ہے جب بھی مصیبت لیکر

آتی ہے اور جب جاتی ہے جب بھی مصیبت چھوڑ کر جاتی ہے۔ بہر حال اس کے بٹورنے کی مساعی کی جگہ اگر آپ اپنی سیرت کو بنانے کا فکر کریں تو دُنیا ہاتھ سے نہ جائے گی اور آخرت بھی درُست ہو جائے گی۔

خاتمہ حاصل یہ ہے کہ انسان کو علم ہی کی وجہ سے افضلیت اور نیابت ملی اور وہ کائنات کی ساری ذی شعور مخلوقات پر بازی لے گیا۔ اس لیے اس فضیلت کو اپنے حق میں باقی کر لیجئے اور جو منصب حق تعالےٰ نے بلاقیمت عطا فرما دیا ہے اس کے تحفّظ کی سعی کیجئے۔ حق تعالےٰ ہمیں توفیق دے کہ علم بھی حاصل کریں اور عمل سے بھی آراستہ ہوں۔ آمین۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب

محمّد طیّب

مدیر دار العلوم دیوبند

۲۲ر اکتوبر ۱۹۵۸ء